پروفیسر رشید احمد

جمال الدین افغانی کے سیاسی افکار

انیسویں صدی عیسوی میں مسلمانوں کے خلاف یورپی ممالک کی ریشہ دوانیاں اپنے عروج پر تھیں۔ انہوں نے اسلامی ملکوں پر قبضہ جمانے کے لیے طاقت کے ساتھ ساتھ دوسرے ہتھکنڈوں سے بھی کام لیا۔ کبھی علم بردار تہذیب، ثقافت بن کر کسی ملک کو غلام بنا لیا تو کہیں تاجر کے بھیس میں آکر تخت و تاج کے مالک بن گئے۔ ایک بھی اسلامی ملک ایسا نہ تھا جس پر وہ قابض نہ رہے ہوں یا جو معاشی اور سیاسی لحاظ سے ان کا غلام نہ ہو۔ افغانستان، ہندوستان، ایران و مصر کا ذکر ہی کیا خود ترکی کی حیثیت "مردِ بیمار" کی تھی۔ اس کے یورپی مقبوضات اس سے ایک ایک کر کے چھینے جا چکے تھے اور اس کے حصے بخرے کرنے کے علانیہ طور پر منصوبے باندھے جا رہے تھے۔ ان حالات میں بھی مسلمانوں میں اتحاد و عنقا تھا۔ ایک ملک کے مسلمان کو دوسرے ملک کے مسلمان سے کسی قسم کی ہمدردی نہ تھی۔ اس کی بھی ذمہ داری مغربی شاطروں پر عائد ہوتی ہے۔ انہوں نے کم عقل اور جاہل مسلمانوں کے ذہنوں میں یہ بات خوب اچھی طرح بٹھا دی تھی کہ قومیں وطن سے بنا کرتی ہیں۔ جس کے باعث ہر شخص جذبۂ وطن پرستی سے سرشار تھا۔ اس جذبے نے حالات کو بد سے بدتر بنا دیا۔ اور مغربی سیاست دانوں کو کھل کھیلنے کا موقع ہاتھ آیا اور انہوں نے اسلامی ممالک کو چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں میں تقسیم کر کے سب کو غلام بنا لیا اور ان میں سے کسی نے اسی وطن پرستی کی وجہ سے دوسرے کی مدد نہیں کی۔ اور جو ملک غلام نہ بنے وہ بھی یورپی اقوام کی ریشہ دوانیوں کی آماجگاہ بن گئے اور ان کے سایۂ عاطفت میں شخصی اور استبدادی حکومتیں قائم ہو گئیں جو عوام کے لیے بلائے بے درماں بن گئیں۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ چند سالوں میں مسلمانوں کا نام و نشان ہی کرۂ ارض سے مٹا کر رکھ دیا جائے گا۔ لیکن انیسویں صدی کے تقریباً وسط میں افغانستان جیسے پسماندہ ملک میں ایک ایسی ہستی پیدا ہوئی جس نے ہوا کا رخ ہی موڑ دیا۔ مسلمانوں کو جھنجھوڑ جھنجھوڑ کر جگایا۔ ان میں اتحاد و اتفاق کی روح پھونکی اور انہیں احساس زیاں دلایا۔ وہ جمال الدین افغانی تھے جو قدامت پسند ملاؤں، مطلق العنان شہنشاہوں اور مغرب کے عیار سیاست دانوں سے تن تنہا لڑے۔ وہ اگرچہ اپنی زندگی میں اپنی قربانیوں اور جانفشانیوں کا ثمرہ نہ دیکھ سکے لیکن بیسویں صدی میں مسلمانوں کی بیداری اور مغرب کے آہنی پنجوں سے متعدد ممالک کی رہائی ان ہی کی رہین منت ہے۔

حالاتِ زندگی

سید جمال الدین افغان شعبان ۱۲۵۴ھ مطابق نومبر ۱۸۳۹ء میں افغانستان کے کونٹر نامی ایک گاؤں میں پیدا ہوئے جو جلال آباد کے قریب ہے۔ ان کا تعلق ایک معزز سید گھرانے سے ہے جو علم و فضل میں بڑی شہرت کا مالک تھا۔ ان کے والد سید صفدر اپنے زمانے کے مشہور عالم تھے اور عوام پر ان کا خاصا اثر تھا۔ دوست محمد خاں افغانستان کا امیر تھا۔ شخصی حکومتوں میں عوام میں مقبولیت ایک سنگین جرم ہے۔ سید صفدر کی ہر دلعزیزی کے باعث انہیں امیر نے کونٹر سے بلا کر پورے گھرانے کے ساتھ کابل میں نظر بند کر دیا۔ افغانی کی عمر اس وقت آٹھ سال کی تھی۔ کابل پہنچنے کے بعد ہی انہوں نے تعلیم کا آغاز کیا اور ابتدائی تعلیم والد سے حاصل کی۔ اس نظر بندی کی میعاد بھی آٹھ سال ہے لیکن اس سے فائدہ یہ ہوا کہ افغانی کو کابل کے علماء سے فیض حاصل کرنے کا موقع مل گیا۔ انہوں نے اس قلیل مدت میں علوم شرعی کے علاوہ فلسفہ، ریاضی، نجوم اور تاریخ میں دستگاہ حاصل کر لی۔ جب امیر دوست محمد خاں نے سید صفدر کو اپنے گاؤں واپس جانے کی اجازت دیدی تو افغانی بھی ان کے ہمراہ کونٹر پہنچے۔ سید صفدر جلد ہی فوت ہو گئے۔ والد کے انتقال کے بعد افغانی کا ذوق علم انہیں کشاں کشاں ہندوستان لایا۔ کچھ عرصہ قیام کے بعد وہ فریضۂ حج کے لیے حرمین شریفین جا پہنچے۔ انہوں نے مشرق وسطیٰ کے متعدد ممالک کی سیاحت کی اور تین سال کے بعد واپس آئے۔

۱۲۷۹ھ میں امیر دوست محمد خاں نے انہیں اپنا مشیر بنا لیا اور اپنے بیٹے محمد اعظم خاں کی اتالیقی کا فرض بھی ان کو سونپا گیا۔ اس زمانے میں ہرات ایران کے زیر نگین تھا۔ اور ایران کے بادشاہ کی طرف سے امیر کا بھائی سلطان احمد خاں اس کا گورنر تھا۔ انگریزوں کے ایما پر دوست محمد خاں ہرات پر حملہ آور ہو کر اس پر قابض ہو گیا۔ اس مہم میں افغانی نے کارہائے نمایاں انجام دیئے بلکہ یہ کہنا مبالغہ نہیں کہ اس کامیابی کا سہرا ہی ان کے سر ہے۔ امیر کے انتقال کے بعد ان کی وصیت کے مطابق ان کا چھوٹا لڑکا شیر علی کابل کے تخت پر بیٹھا۔ افغانستان پر خونریزی اور خانہ جنگی کے کالے بادل چھائے ہوئے تھے۔ لیکن افغانی ہی کی تگ و دو کا ثمرہ تھا کہ شیر علی کے بڑے بھائی جو اس کی تخت نشینی کو اپنی حق تلفی سمجھتے تھے اپنے دعوے سے دست بردار ہو گئے۔ افغانی شیر علی کے مشیر خصوصی تھے۔ لیکن وزیر، خانہ جنگی میں اپنا مفاد سمجھتا تھا۔ اس کے مشورے سے شیر علی نے افغانی کی شدید مخالفت کے باوجود اپنے بھائیوں کو گرفتار کرنے کی کوشش کی۔ لیکن اس پر عمل ہونے سے پہلے ہی بھائیوں کو اس کی اطلاع ہو گئی اور وہ شیر علی کی دسترس سے باہر نکل گئے۔ اس واقعہ کا اثر افغانی پر بہت ہوا اور وہ دوسری بار ۱۲۸۶ھ میں ہندوستان آئے۔ جب شیر علی کا بڑا بھائی اور افغانی کا شاگرد محمد اعظم خاں کابل پر قبضہ کرنے میں کامیاب ہو گیا تو افغانی وطن

واپس آئے اور اعظم کے مشیر مقرر ہوئے۔ لیکن ڈیڑھ سال کے بعد ہی قسمت نے پلٹا کھایا اور شیر علی کابل واپس لینے میں کامیاب ہو گیا۔ اور اعظم خاں کو راہ فرار اختیار کرنی پڑی تو افغانی نے بھی وطن کو خیر باد کہہ دیا۔ اس وقت ان کی عمر تیس سال کی تھی۔

تیسری بار افغانی ہندوستان آئے انگریزوں کو ان سے خطرہ تھا اس لیے ان پر قدغن بٹھا دیا گیا۔ وہ نہ تو کسی ہندی عالم سے مل سکتے تھے اور نہ ہی کوئی عالم ان سے ملاقات کر سکتا تھا۔ ان حالات میں ان کا ٹکنا مشکل ہو گیا اور وہ جلد ہی مصر کے لیے روانہ ہو گئے جہاں انہوں نے ایک معلم کی حیثیت سے بہت جلد شہرت حاصل کر لی۔ یہاں چالیس دن ہی رہنے پائے تھے کہ انگریزوں نے خدیو مصر پر دباؤ ڈال کر انہیں مصر سے نکلوا دیا۔ مصر کے قیام کے دوران میں افغانی کو نہایت ذہین شاگرد مل گئے تھے جن میں آگے چل کر محمد عبدہٗ نے بہت شہرت حاصل کی۔ مصر سے وہ قسطنطنیہ آئے۔ ترکی عوام نے ان کا پرجوش خیر مقدم کیا۔ افغانی کے اثر و رسوخ نے قدامت پسند علماء کو ان کا مخالف بنا دیا۔ ان کے خلاف کفر کے فتوے صادر کئے گئے اور آخر کار ترکی سے بھی نکلوا کر دم لیا۔ وہ پھر ۱۲۸۸ھ میں مصر آئے۔ اس بار انہوں نے مصر کی سیاسی اور سماجی اصلاح میں زبردست حصہ لیا۔ جامع ازہر کے نصاب میں بنیادی تبدیلیاں کیں۔ جدید علوم داخل نصاب کئے گئے۔ فلکیات اور فلسفہ پر خود بھی لکچر دیا۔ مصر کی معاشی حالت کو سدھارنے کے لئے انجمن محفل وطنی کے نام سے ایک ادارہ قائم کیا۔ جس کا مقصد ممبروں میں سادگی اور کفایت شعاری کو فروغ دینا تھا۔ مصری صحافت بھی افغانی کی رہین منت ہے۔ انہوں نے معیاری اخبارات جاری کئے جن میں خبروں پر تبصرہ کا آغاز کیا گیا۔ اور سیاست حاضرہ پر شدید نکتہ چینی کی جانے لگی۔ افغانی کی تعلیمی، معاشرتی، معاشرتی اور سیاسی اصلاحات کے باعث عوام میں بیداری کی ایک لہر دوڑ گئی اور نتیجۃً خدیو اسمٰعیل کو تخت سے دست بردار ہونا پڑا۔ اور توفیق بے جو افغانی کے ہم خیالوں میں سے تھا خدیو مقرر ہوا۔ خدیو بننے کے بعد توفیق کا رویہ بدل گیا۔ اس نے افغانی کو نہایت بے سر و سامانی کی حالت میں مصر سے نکال دیا۔ وہ ہندوستان پہنچے۔ بمبئی اور حیدرآباد میں قیام کیا اسی سال مصری کاشتکاروں نے بغاوت کر دی تو افغانی کو کلکتہ لے جا کر نظر بند کر دیا گیا۔ لیکن جب یہ بغاوت فرو ہو گئی تو افغانی پر سے تمام پابندیاں بھی اٹھا لی گئیں۔ وہ افغانستان پہنچے یہ امیر عبدالرحمٰن کا عہد تھا۔ افغانی نے یہاں اصلاحات کے نفاذ کی کوشش کی۔ ناکامی کے بعد وہ ہندوستان ہوتے ہوئے لندن اور پیرس کے سفر پر روانہ ہو گئے۔ پیرس میں وہ نہایت آزادی کے ساتھ اظہار خیال کر سکتے تھے۔ اپنے شاگرد محمد عبدہٗ کے ساتھ مل کر انہوں نے ایک جماعت کی داغ بیل ڈالی جس کا نام الجمعیۃ العروۃ الوثقیٰ رکھا۔ اس جماعت کے ترجمان کی حیثیت سے ایک ہفتہ وار اخبار "العروۃ الوثقیٰ" کے نام سے جاری کیا گیا۔ یہ اخبار اٹھارہ اشاعتوں سے زیادہ تو

نہ چل سکا تاہم مشرق و مغرب میں اس نے تہلکہ مچا دیا۔

افغانی نے مہدی سوڈانی کی تحریک کے زمانے میں برطانیہ اور مصر میں مصالحت کرانے کی کوشش کی لیکن کامیاب نہ ہو سکے۔ آخر کار وہ روس کی طرف ملتفت ہوئے۔ انہوں نے ماسکو کا سفر کیا اور روسی مسلمانوں پر سے مذہبی پابندیوں کا ختم کرانا ان کا ایک شاندار کارنامہ ہے۔ وہ شاہی دعوت پر ایران گئے لیکن وہاں زیادہ ٹھہر نہ سکے کیونکہ شہنشاہ نے ان کی مجوزہ اصلاحات کو مسترد کر دیا۔ ایران سے وہ دوسری مرتبہ روس آئے۔ دو سالہ قیام کے باوجود وہ روس، افغانستان اور ایران میں دوستی بڑھانے میں کامیاب نہ ہو سکے۔ وہ آخر کار جرمنی ہوتے ہوئے پیرس پہنچے۔ شاہ ایران نے دوبارہ دعوت دی لیکن اس بار بھی وہ زیادہ عرصے تک ایران میں نہ رہ سکے اور انہیں بیماری کی حالت میں پا بجولاں ایران سے نکال دیا گیا۔ لیکن ایران میں جو بیداری انہوں نے پھیلائی تھی وہ رنگ لائے بغیر نہ رہ سکی۔ اور جب بادشاہ نے تمباکو کی اجارہ داری ایک غیر ملکی کمپنی کو دیدی تو افغانی کے ایما پر مجتہد اعظم نے تمباکو کے حرام ہونے کا فتویٰ صادر کر دیا جس کی وجہ سے سارا تمباکو تباہ کر دیا گیا۔ اور شاہ ایران بھی ایک محب وطن کی گولی کا نشانہ بن گیا۔

ایران سے وہ لندن پہنچے اور ضیاء الخافقین نامی ایک اخبار نکالا۔ جس کا ہدف اعتراض شاہ ایران تھا۔ اس کے بعد سلطان عبدالحمید کے بے حد اصرار پر ۱۸۹۲ء میں قسطنطنیہ گئے۔ سلطان افغانی کی مدد سے ایک اسلامی وفاق قائم کر کے اس کا سربراہ بننے کا خواہاں تھا۔ اس زمانہ میں انہوں نے اتحاد اسلامی کی تحریک کو تیز تر کر دیا لیکن وہ سلطان کے خود غرضانہ رویہ سے بدظن ہو گئے۔ حاسدوں نے بھی سلطان کو ان کے خلاف خوب بھرا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ انہیں قسطنطنیہ میں نظر بند کر دیا گیا۔ جہاں وہ مرض سرطان میں مبتلا ہو کر شوال ۱۳۱۴ھ مطابق ۹ مارچ ۱۸۹۷ء کو انتقال کر گئے۔ کچھ مورخین ان کی موت کا سبب زہر خورانی بتلاتے ہیں۔ افغانی قسطنطنیہ میں مدفون ہوئے بعد میں ان کی لاش افغانستان لائی گئی۔

تصانیف

جمال الدین افغانی نے کل ۵۸ سال کی عمر پائی۔ وہ ایک جگہ کبھی چین سے نہ بیٹھے۔ آج مصر میں ہیں تو کل ترکی میں۔ سولہ سال کی عمر سے ۵۸ سال کی عمر تک ایک جگہ رہنے کی زیادہ سے زیادہ مدت پانچ سال ہے جو انہوں نے آخری عمر میں ترکی میں گزارے۔ وہ بھی نظر بندی کی وجہ سے مجبور تھے۔ ایشیا اور یورپ کا شاید ہی کوئی ملک ہو جہاں وہ نہ گئے ہوں۔ اس سیاحت کے علاوہ عمر کا ایک بڑا حصہ عملی سیاست اور معلمی میں بھی بسر کیا ہے۔ ایسے شخص سے زیادہ تصانیف کی توقع نہیں کی جا سکتی۔ اس کے باوجود افغانی نے مختلف شکلوں میں اپنی

تصانیف کا ایک معتدبہ ذخیرہ چھوڑا ہے۔ انہوں نے اپنے خیالات کے اظہار کے لیے متعدد زبانوں کو ذریعہ بنایا۔ عربی اور فارسی کے علاوہ انگریزی اور فرانسیسی زبانوں میں انہوں نے مضامین اور خطوط لکھے۔ ان تصانیف میں ایک گرانمایہ تصنیف افغانستان ہے جس کا نام "تتمہ البیان فی تاریخ افغان" ہے۔ کتاب فارسی زبان میں لکھی گئی تھی۔ عربی میں بھی اس کا ترجمہ ہوا۔ اس کتاب میں سید صاحب کے سیاسی افکار ملتے ہیں۔ اس کے علاوہ ایک رسالہ جو عربی اور فارسی دونوں زبانوں میں لکھا گیا "الرد علی الدہریین" ہے۔ جس میں نیچریوں کے عقائد کی بہ دلائل تردید کی گئی ہے۔ اس کتاب میں بھی ضمناً سیاسی نظریات جابجا بیان ہوئے ہیں۔ مذہب فاضلہ اور اسلام میں گہرا تعلق بتلایا گیا ہے۔ افغانی پیرس سے "العروۃ الوثقیٰ" اور لندن سے "ضیاء الخافقین" جاری کئے تھے جن میں ان کے بلند پایہ سیاسی مضامین شائع ہوا کرتے تھے۔ اول الذکر میں انہوں نے مغربی ممالک کی عیارانہ چال اور ان کی سیاست کی پردہ دری کی ہے۔ اور مؤخر الذکر میں ایرانی سیاست کو اعتراض کا ہدف بنایا گیا ہے۔ العروۃ الوثقیٰ عربی میں شائع ہوتا تھا اور ضیاء الخافقین میں عربی اور انگریزی دونوں زبانوں کے مضامین ہوتے تھے۔

افغانی کے فارسی مضامین جو "مقالات جمالیہ" کے نام سے شائع ہوئے ہیں ادبی اور علمی لحاظ سے بہت اہم ہیں۔ ان میں زیادہ تر تعلیمی اور اصلاحی موضوعات پر اظہار خیال کیا گیا ہے۔ ان مضامین میں اکثر و بیشتر ایسے ہیں جو قیام ہند کے دوران میں لکھے گئے اور رسالہ "معلم شفیق" اور "معلم" میں شائع ہوئے۔ جن میں علم کی اہمیت اور علوم کے سلسلے میں مشرق و مغرب، قدیم و جدید کے فرق کو نارواں بتلایا ہے اور مسلمانوں کو تلقین کی ہے کہ جو علم مفید ہو اس کو اپنائیں خواہ وہ کسی بھی ملک یا خطے سے تعلق رکھتا ہو۔

ان کتب و رسائل کے علاوہ افغانی نے انگریزی مضامین کا ایک بڑا ذخیرہ چھوڑا ہے۔ مختلف زبانوں میں ان کے خطوط بھی خاصی اہمیت کے مالک ہیں۔

اسلوب بیان و طرز استدلال

افغانی نے مختلف زبانوں میں کتابیں، مضامین اور مکاتیب لکھے۔ ان میں سے ہر ایک زبان پر وہ کماحقہ قدرت رکھتے ہیں اور ہر ایک میں صاحب طرز مصنف ہونے کا انہیں فخر حاصل ہے۔ ان کی تحریروں کے کردار کی آئینہ دار ہے۔ افغانی عمل کے پتلے اور دھن کے پکے تھے۔ جوش و خروش ان کی رگ و پے میں سرایت کر چکا تھا۔ ان کی فطرت میں گرمی اور سوز کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا۔ یہ تمام چیزیں ان کی تحریروں میں بہت نمایاں ہیں۔ ان کے کردار میں جرأت و بے باکی کو بہت اونچا مقام حاصل ہے۔ ان کی تصانیف کے ایک ایک لفظ سے ان کی جرأت مندی اور دلیری واضح ہوتی ہے۔ اسی لیے وہ جو کچھ کہتے ہیں صاف اور کھلے بندوں کہتے ہیں۔

گول مول بات کہنے کے وہ قائل نہیں۔ جب کسی کو اپنے اعتراضات کا نشانہ بناتے ہیں تو لگی پٹی نہیں رکھتے اور جب کسی کی تعریف و توصیف کرتے ہیں تو اس میں بھی کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھتے۔ بقول قاضی عبدالغفار صاحب کے "وہ الفاظ کو سیاسی کھیل کبھی نہ کھیلتے تھے۔ صاف کہتے تھے جس طرح صاف سمجھتے تھے۔ پتھر کا جواب پتھر سے دیتے تھے اور لوہے کو لوہے سے کاٹتے تھے۔" یہاں اس کی دو ایک مثالیں دینا بے موقع نہ ہوگا۔

افغانی کو سرسید اور ان کے ساتھیوں سے اختلاف ہے۔ وہ لکھتے ہیں "ہندوستان کا ایک آدمی احمد خاں انگریز سے فائدہ حاصل کرنے کی خاطر ان کے محلوں کا طواف کرتا تھا۔ اس نے اپنے آپ کو انگریزوں کے سامنے پیش کیا۔ اپنے مذہب کو چھوڑنے اور انگریزی مذہب اختیار کرنے کے لیے چند قدم آگے بڑھائے ..... احمد خاں اور اس کے پیروکاروں نے دین کا لباس خود اتارا اور مسلمانوں میں فتنے ڈالتے اور ان کی آواز کمزور کرنے کے لیے انہیں بھی دین چھوڑنے کی طرف دعوت دی۔" مولوی سمیع اللہ خاں کے متعلق لکھتے ہیں "وہ ہریوں میں سب سے بڑا مکار اور سب سے بڑا حیلہ ساز ہے۔ اس کی چالیں بڑی گہری ہوتی ہیں اور مسلمانوں کو گمراہ کرنے اور ان کے اتفاق و اتحاد کو ختم کرنے کے نت نئے راستے نکالنے اور ہندوستان میں انگریزی حکومت کے قدم مضبوط کرنے میں اس کا نمبر بڑھ چڑھ کر ہے۔ یہ مکار شخص مسلمانوں کی مجالس میں تقریر کرنے کھڑا ہوتا ہے تو بات کرنے سے پہلے اس کے آنسو رواں ہو جاتے ہیں اور اسلام کو مٹانے اور اس کے بنیادی اصول کو باطل کرنے کے لیے وہ انتہائی درجے کی فصاحت استعمال کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی ذات اور پیغمبروں پر اعتراضات کرتا اور پھر اس زور زور سے روتا ہے گویا اسے دین اور دینداری کا غم کھائے جا رہا ہے۔" یہ تو خیر سرسید اور سمیع اللہ ہی ہیں افغانی بڑے بڑے بادشاہوں کو بھی کھری کھری سنانے سے دریغ نہیں کرتے۔ وہ ناصر الدین شاہ قاچار کے متعلق لکھتے ہیں "بادشاہ کا دل و دماغ دونوں ماؤف ہو چکے ہیں۔ اس کی سیرت بگڑ چکی ہے اس کے حرکات ضعیف اور اس کے علامات قبیح ہو چکے ہیں۔ وہ ملکی سیاست اور اللہ کی مخلوق کے مفاد سے عاجز آ چکا ہے۔ ..... جب سے بلاد افرنگ سے واپس آیا ہے حیا کے جامے کو اس نے بالکل اتار پھینکا ہے۔ شرابیں پیتا ہے کفار سے دوستی کرتا ہے اور دینداری سے دشمنی رکھتا ہے۔"

اس صاف بلکہ بے محابا گوئی کے علاوہ افغانی کی تحریر کی سب سے بڑی خصوصیت اختصار ہے۔ ان کے مضامین حشو و زوائد سے بالکل پاک ہیں۔ وہ مضمون کو پھیلاتے ضرور ہیں لیکن نہایت عمدگی کے ساتھ سمیٹ لیتے ہیں۔ جس کے باعث بلا کی تاثیر پیدا ہو جاتی ہے پھر ان کا خلوص اور نیک نیتی بھی تاثیر میں اضافہ کر دیتے ہیں۔ بالخصوص جہاں انہوں نے خطیبانہ طرز اختیار کیا ہے اسے پڑھ کر سخت سے سخت

دل موم بن جاتے ہیں مثلاً وہ اسلامی اتحاد کے لیے مسلمانوں کو للکارتے ہوئے کہتے ہیں "اے بہادروں کی یادگار مردو! اے سورماؤں کے جانشینو! اے سرداروں کے وارثو! کیا تمہارے اقبال کا دور ختم ہو چکا ہے؟ کیا تلافی مافات کا موقع ہاتھ سے نکل چکا ہے؟ کیا ناامیدی کی گھڑی سر پر آگئی ہے؟" وہ علماء کو دعوت عمل اس طرح دیتے ہیں "اے رحمت کا ساتھ دینے والو! اور شفقت کی مدد کرنے والو! تم کہاں ہو؟ اے مروت کے پہاڑو! اور طاقت کی چٹانو! تم کہاں ہو؟ کمک دینے کے لیے ہر وقت تیار رہنے والو! اور سختی کے وقت مظلوم کی فریاد سننے والو تم کہاں ہو؟ اے اس بہترین جماعت کے اراکین جسے اللہ تعالیٰ نے نیکیوں کو پھیلانے اور برائیوں کو روکنے کے لیے پیدا کیا تھا! کہاں ہو؟

افغانی اپنے خیالات کو مختلف پیرایوں میں ادا کرنے پر قدرت کاملہ رکھتے ہیں۔ ایک ہی بات کو ذہن نشین کرانے کے لیے نئے نئے طریقوں سے اسے بار بار دہراتے ہیں۔ اس کے علاوہ جو چیز پڑھنے والے کا دل موہ لیتی ہے وہ ان کی وسعت معلومات ہے۔ جو ان کی تمام تحریروں میں بلا استثنا محسوس ہوتی ہے۔ جغرافیہ تاریخ، شرعی علوم اور سائنس وغیرہ کے جواہر ریزے افغانی نے اپنی تحریروں میں جا بجا بکھیرے ہیں۔

افغانی کے طرز استدلال کو اگر کوئی نام دیا جا سکتا ہے تو وہ واعظانہ ہے۔ وہ اپنے افکار کے اثبات کے لیے کلام اللہ سے اکثر کام لیتے ہیں۔ مسلمانوں کے اتحاد کی جب تلقین کرتے ہیں تو انما المومنون اخوۃ کی آیت پیش کرتے ہیں۔ جہاں انہوں نے کفار سے ترک موالات کی تاکید کی ہے وہ چند آیات کا حوالہ دیتے ہیں: فلا تتخذوا عدوی وعدوکم اولیاء تلقون الیھم بالمودۃ وقد کفروا بما جاءکم من الحق۔ (میرے دشمنوں اور اپنے دشمنوں کو دوست نہ بناؤ۔ تم ان کے پاس دوستی لے کر جاتے ہو حالانکہ وہ اس حق سے منکر ہو چکے ہیں جو تمہارے پاس آیا ہے) نیز۔ لا تتخذوا بطانۃ من دونکم لا یألونکم خبالا ودوا ما عنتم قد بدت البغضاء من افواھھم وما تخفی صدورھم اکبر۔ اپنے سوا دوسروں کو اپنا رازدار نہ بناؤ وہ تمہیں نقصان پہنچانے میں کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھیں گے۔ تم کو جتنی تکلیف ہوتی ہے ان کو خوشی ہوتی ہے۔ دشمنی ان کی زبانوں سے بھی ظاہر ہو چکی ہے اور جو کچھ ان کے سینوں میں چھپا ہوا ہے وہ اس سے بھی زیادہ ہے)۔

قرآن مجید کے بعد وہ احادیث نبوی سے استدلال کرتے ہیں۔ اتحاد المسلمین کی اہمیت واضح کرنے کے لیے انہوں نے متعدد احادیث نقل کی ہیں۔ مثلاً المومن للمومن کالبنیان یشد بعضہ بعضا (ایک مومن دوسرے

مومن کے لیے عمارت کے مثل ہوتا ہے جس کے اجزا ایک دوسرے کو مضبوط کرتے ہیں، اور یہ حدیث لاتقاطعوا ولا تدابروا ولا تحاسدوا وکونوا عباد اللہ اخوانا (باہمی تعلقات کو ختم نہ کرو۔ ایک دوسرے کی غیبت نہ کیا کرو، آپس میں حسد نہ کرو، خدا کے بندو بھائی بھائی بن جاؤ)۔

افغانی تاریخ سے بھی مثالیں دیتے ہیں۔ اس میں وہ تاریخ اسلام کے علاوہ امم عالم کے تاریخی واقعات بھی پیش کرتے ہیں۔ ان کے نزدیک غیر مسلم اقوام کے حالات سے عبرت حاصل کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں ہے۔ جہاں وہ رنگ و نسل کے مضر اثرات گنواتے ہیں تو مسلمانوں کی تاریخ سے اس طرح استدلال کرتے ہیں "جس دن اسلام کا سنگ بنیاد رکھا گیا تھا اس وقت سے لے کر آج تک مسلمانوں کی تاریخ گواہ ہے کہ وہ قبائل اور رنگ و نسل کی بنیاد پر قائم ہونے والے اتحاد و اجتماع کو کوئی وقعت نہیں دیتے۔ ان کے نزدیک صرف مذہبی اخوت ہی قابل اعتنا ہے"۔ وہ یونان، ایران اور فرانس وغیرہ کی تاریخوں سے بھی نہایت بے تکلفی کے ساتھ حوالے پر حوالے دیئے چلے جاتے ہیں۔ ایران قدیم کے فرمانروا اور اسکندر اعظم کے واقعات اکثر انہوں نے بیان کئے ہیں۔

اپنے خیالات کی وضاحت کے لیے افغانی تشبیہات بھی پیش کرتے ہیں۔ وہ اتحاد و اتفاق کے فوائد گنواتے ہوئے کہتے ہیں کہ اس کی وجہ سے قومی زندگی اور قومی عظمت کے مختلف راستے ایک ہی مرکز پر جاکر ختم ہوتے ہیں۔ متحدہ قوم اپنے فوائد کو حاصل کرنے اور اپنے منافع کا پورا پورا خیال رکھنے میں ان دریاؤں کی طرح ہے جو سمندر کو پانی دیتے ہیں۔ جس کا پانی دوبارہ بادلوں کے ذریعہ انہی میں آکر جمع ہو جاتا ہے۔ یا وہ وہم کو قومی زوال کا سب سے بڑا سبب قرار دیتے ہیں۔ اور بالخصوص انگریزوں کے معاملے میں اہل مشرق ان کے نزدیک وہم میں مبتلا ہیں۔ وہم کے نقصانات کی مثال وہ یہ دیتے ہیں کہ کوئی مسافر جنگل میں شیر کی لاش کو دیکھ کر اسے زندہ سمجھے تو لازماً اس پر لرزہ طاری ہو جائے گا۔ یا ڈر کے مارے وہیں جان دیدے گا۔ یا خوف اور سراسیمگی کے عالم میں اندھا دھند بھاگنا شروع کر دیگا۔ اور راستہ گم کر کے بھٹکتا پھرے گا۔ اور ہو سکتا ہے کہ اس گمراہی اور آوارہ گردی میں وہ ہلاک ہو جائے۔

سیاسی نظریات

افغانی کے سیاسی نظریات کا جائزہ لینے سے قبل یہ بات اچھی طرح ذہن نشین کر لینی چاہیئے کہ ان کا زمانہ مسلمانوں کے ادبار کا بدترین عہد تھا۔ یوں تو کہنے کو بہت سی اسلامی حکومتیں قائم تھیں لیکن ان میں سے اکثر کے

باہمی تعلقات معاندانہ تھے۔ اور باقی ماندہ ملکوں کو دوسرے مسلم ممالک سے کوئی ہمدردی نہ تھی۔ یورپی اقتدار کے سیلاب نے ان کو بُری طرح گھیر رکھا تھا اور بہت سے ملک تو اس کی نذر بھی ہو چکے تھے۔ افغانی کا عہد بہت حد تک ابن تیمیہ کے زمانے سے ملتا جلتا ہے۔ مؤخر الذکر کے زمانے میں منگول بلائے بے درماں بن کر مشرق سے آئے تھے۔ افغانی کے زمانے میں مصائب و آلام کی گھٹا مغرب سے اٹھی تھی۔ اور منگولی فتنہ سے کئی گنا زیادہ خطرناک تھی۔ کیونکہ اسلحاتِ جنگ کے علاوہ سازش، فریب اور عیاری کیا کچھ نہ تھا۔ اس قسم کے حالات میں مفکر یا تو نرا حقیقت پسند بن جاتا ہے یا بالکل ہی حقائق سے آنکھیں بند کر لیتا ہے۔ لیکن افغانی ان حالات سے بہت زیادہ متاثر معلوم نہیں ہوتے۔ ان کے افکار پر حقیقت کا گہرا رنگ ضرور ہے لیکن انہوں نے تصوریت (IDEALISM) کا دامن بھی ہاتھ سے نہیں جانے دیا۔

اجتماع

افغانی نے انسانی خصوصیات سے بحث کی ہے۔ ان کے نزدیک انسان دو وجودوں کا مالک ہے۔ وہ ایک وجود کو وجود انفرادی کا نام دیتے ہیں۔ قدرت نے انسان کو اپنی حفاظت کرنے کے لیے، نوع انسانی کی بقا کی خاطر، اور اپنی نسل بڑھانے کے لیے مخصوص قوتیں عطا کی ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ ان قوتوں میں وہ دیگر حیوانات کے ہم پلہ ہے۔ البتہ افغانی ایک لطیف سا فرق ضرور محسوس کرتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ جہاں تک انسان کی انفرادی ضروریات کا تعلق ہے وہ دیگر حیوانات سے صرف اس بات میں ممتاز ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو "صناع" بنا کر دنیا میں بھیجا ہے۔ اس کو اپنے کام کے انجام دینے کی جملہ سہولتیں فراہم کی ہیں۔ ایجاد و اختراع کی راہیں بھی اس کے لیے کھول دی ہیں۔ اسے نہ صرف اپنے ہاتھ سے رزق تیار کرنے کا گُر بتلایا ہے بلکہ اسی رزق پر اس کے وجود اور بقا کا انحصار ہے۔ مزید وضاحت کے لیے وہ مثال دیتے ہیں کہ انسان کو کوئی چیز تیار نہیں ملتی۔ اسے زمین کی کاشت اور مویشیوں کی دیکھ بھال کے بعد کہیں جا کر اپنا پیٹ بھرنا نصیب ہوتا ہے۔ یہی حال اس کے ملبوسات کا ہے۔ کپڑے نہایت مشقت کے بعد بُن کر وہ زیب تن کرتا ہے۔ اپنے پیروں کو زمین کی خراش سے بچانے کے لیے اسے جوتے گانٹھنے پڑتے ہیں۔ اسی طرح اس کے مکانات میں بھی اس کے دماغ کو بڑا دخل حاصل ہے۔ افغانی ان تمام مشاہدات کے بعد اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ "انسان کے پاس عیش و تنعم کے جتنے بھی دلفریب سامان موجود ہیں وہ درحقیقت اسی کے اعمال و افکار ہیں جو مادی شکل اختیار کر کے سامنے آتے ہیں۔"

افغانی مزید کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے دیگر حیوانات کے مقابلے میں انسان کو شرف بخشا ہے۔ اور اسے بلند پایہ اور ترقی یافتہ زندگی عنایت کی ہے۔ اور یہ زندگی اجتماع کی شکل میں نمودار ہوتی ہے۔ وہ انسانی اجتماع کی مثال

جسم سے دیتے ہیں اور کہتے ہیں: "ایک ہی خیال کے بے شمار افراد سے ایک جسم یا مجموعہ بنتا ہے۔ اور یہ جسم یا مجموعہ ایک نام سے مخصوص کیا جاتا ہے اس کے وجود میں افراد اعضا کا کام دیتے ہیں۔ اور مختلف شکلوں میں مختلف فرائض بجالاتے ہیں۔ ہر فرد جسم اجتماعی کی بقا، اس کی تقویت اور اس کی زندگی کو زیادہ سے زیادہ کامیاب بنانے کے لیے کوشاں رہتا ہے۔ اس لیے کہ جسم اجتماعی کے مجموعی فائدے اور ترقی سے اسے بھی فائدہ پہنچے گا۔ بعینہ اسی طرح جس طرح اعضاء جسم کے اعمال و وظائف میں مشغول ہوتے ہیں اور جسم کی قوت کا فائدہ ان کو بھی پہنچتا ہے۔"

محرکات

افغانی نے اجتماع کے اسباب پر بھی روشنی ڈالی ہے۔ وہ اجتماع کے لیے نسبی رشتوں کی اہمیت سے منکر تو نہیں ہیں تاہم اسے محض ضرورت اور مجبوری کے طور پر اتحاد کا ذریعہ بتلاتے ہیں۔ وہ اپنے ایک مضمون "مسلمانوں کا تنزل وجمود" میں اس طرح رقمطراز ہیں "از روئے قیاس اخوت اور دیگر نسبی رشتوں کو ایک خاص درجہ حاصل ہے لیکن انسان کی عملی اور اجتماعی زندگی میں اس کا وجود صرف اس لیے ہے کہ ضرورتوں اور مجبوریوں کا لاانتہا سلسلہ رشتہ داروں اور خاندانوں کو اس بات پر آمادہ کرتا ہے کہ وہ فوائد حاصل کرنے اور نقصان سے بچنے کے لیے ایک دوسرے کی امداد کریں یہ امداد کچھ مدت گزر جانے کے بعد دلوں میں رشتہ کی اہمیت کو راسخ کر دیتی ہے۔ اور پھر تا زندگی انسان رشتہ کی حفاظت کے لیے مستعد رہتا ہے۔ نفس جس طرح بھوک، پیاس اور سیرابی کو طبعی طور پر محسوس کرتا ہے اسی طرح رشتہ دار بھی آئی ہوئی مصیبت اور ظلم کے وقت دلی ہمدردی اور اس کی امداد کی ضرورت کو طبعی طور پر محسوس کرنے لگتا ہے۔ حالانکہ اس کی یہ کیفیت پہلے پہل محض ضرورت کی پیداوار تھی۔" ان کے نزدیک ہم خیالی یا ایک مزاج کا ہونا اجتماع کا سبب ہے۔

افغانی اجتماع کے اسباب سے زیادہ ان چیزوں سے بحث کرتے ہیں جو اجتماع پر اثر انداز ہوتی ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ "مزاجوں پر غذاؤں اور دواؤں اور مختلف موسموں اور ہواؤں کا نمایاں اثر پڑتا ہے۔ اسی طرح اس کی حکمت کا تقاضا یہ بھی ہے کہ ہر عمل اور ہر وضع بھی انسان کی ہیئت اجتماعی پر باقاعدہ اثر انداز ہوتی ہے۔ . . . . زندگی اور اس کے افعال پر کائنات کی جڑی بوٹیوں کی تاثیر کے اسباب ایک ماہر طبیب تک کی نظر سے غائب رہ سکتے ہیں مگر انسان کی اجتماعی ہیئت پر ان انفرادی حالات کے اثر انداز ہونے کا راز وہ راز ہے جس پر مطلع ہو جانا ہر اس شخص کے لیے آسان ہے جو اپنی بصیرت کی آنکھ ضائع نہ کر چکا ہو۔"

فضائل

افغانی کے نزدیک اجتماع انسانی میں سب سے زیادہ اہمیت فضائل کو حاصل ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ "وجود اجتماعی میں فضائل کو وہی حیثیت حاصل ہے جو وجود انفرادی میں قوتِ حیات کو ہے . . . . بہ الفاظ دیگر فضائل کی حیثیت

عالم انسانی میں وہی ہے جو فضائے عالم میں کشش کی ہے۔" اس کی مثال وہ یہ دیتے ہیں کہ جس طرح ستارے باہمی کشش کی وجہ سے قائم ہیں اسی طرح فضائل کے باعث اجتماع کا وجود برقرار ہے۔ وہ فضائل کی تشریح بھی کرتے ہیں ان کے نزدیک فضائل نفس کی ان خصلتوں کا مجموعہ ہے جو انسان کے درمیان الفت واتفاق کی بنیاد ڈالتی ہیں۔ مثلاً سخاوت، عفت وحیا، صداقت وامانت وغیرہ۔ فضائل کے ذریعہ قیام اجتماع کیوں کر ممکن ہے اس کی وضاحت میں وہ ایک ایک فضیلت کا ذکر تفصیل سے کرتے ہیں۔ مثلاً سخاوت کے متعلق ان کا دعویٰ ہے کہ دو سخی آدمی کبھی ایک دوسرے کے ساتھ بخل سے پیش نہیں آئیں گے۔ اس لیے انہیں کاروبار اور معاملات میں ایک دوسرے سے نزاع کا اندیشہ نہیں ہو سکتا۔ اس کی مزید وجہ وہ یہ بتلاتے ہیں کہ ان میں سے ہر ایک شخص کی خصلت یہ ہوگی کہ حق کی راہ میں خرچ کرے گا اور حق کے تقاضا کے طور پر خرچ سے ہاتھ روکے گا۔ ان میں سے ہر اب اپنے حدود سے واقف ہوگا جس سے تجاوز کرنے کو جائز نہ سمجھے گا۔ جب یہ لوگ آپس میں معاملہ کریں گے تو ان کے درمیان نزاع کا سوال ہی پیدا نہ ہوگا۔ اس کے علاوہ اور بھی مثال دینے کے بعد افغانی کہتے ہیں" الغرض علمائے تہذیب نے جن جن اخلاق کو فضیلت کے اوصاف میں شمار کیا ہے ان میں سے ایک ایک پر غور کرو تو معلوم ہوگا کہ ہر خصوصیت کا خاصہ ہے کہ جن لوگوں میں پیدا ہو جاتی ہے تو وہ ان حدود تک آپس کے جھگڑے اور نزاع سے بچ جاتے ہیں اور ان میں الفت قائم ہو جاتی ہے۔[9]

وہ فضائل کے مجموعے کو عدل کے نام سے پکارتے ہیں اور کہتے ہیں کہ کسی گروہ میں جب عدل پیدا ہو جاتا ہے تو اس کا ہر فرد عمل میں اپنی اپنی حد کے اندر رہتا ہے اور دوسروں کے حدود میں دخل انداز ہونے کی کوشش نہیں کرتا۔ اس طرح اس گروہ کے افراد میں مساوات اور یک جہتی پیدا ہو جاتی ہے۔

افغانی کا دعویٰ ہے کہ رذائل کے باعث انتشار اور پراگندگی پھیل جاتی ہے۔ لیکن اجتماع کے قیام کے لیے پھر فطرت یہ اہتمام کرتی ہے کہ اک ی طاقت اس پر حملہ کرے اور اسے جبراً اپنا تابع فرمان بنا لے اور زندگی کے کاروبار میں مشغول کر دے۔ اس کی وجہ وہ یہ بتلاتے ہیں کہ معاشی ضروریات بغیر اجتماعی زندگی کے پوری نہیں ہوتیں اور رذائل کی وجہ سے اجتماع کا وجود محال ہے۔ اس لیے اجتماعی شکل کو کسی حد تک برقرار رکھنے کے لیے خارجی طاقت کا دخل انداز ہونا ضروری ہوتا ہے۔

عقائد ثلاثہ

وہ فضائل کے حصول کا ذریعہ عقائد ثلاثہ کو بتلاتے ہیں۔ وہ عقیدے یہ ہیں:

اوّل۔ انسان ایک زمینی فرشتہ ہے جو اشرف المخلوقات ہے۔

دوئم۔ وہ جس دین کا پیرو ہے اس کے ماننے والے خیر الامم ہیں اور ان کے علاوہ تمام لوگ باطل اور

گمراہی پر ہیں۔

سوئم۔ انسان اس دنیا میں حصول کمالات کے لیے آیا ہے۔ جن کے ذریعے وہ اس دوسرے عالم میں منتقل ہو جائے گا جو اس تنگ و تاریک عالم سے جسے وہ بیت الاحزان کا نام دیتے ہیں زیادہ وسیع اور زیادہ مکمل ہے۔

افغانی کا دعویٰ ہے کہ ان عقائد ثلاثہ کے باعث افراد میں عمدہ عمدہ فضیلتیں پیدا ہو جاتی ہیں اور ان کی جماعتی زندگی خوشگوار بن جاتی ہے چنانچہ وہ اپنے اس خیال کی توضیح اس طرح کرتے ہیں کہ پہلے عقیدے کی وجہ سے انسان حیوانی خصائل سے بچے گا اور جس قدر اس عقیدے میں پختگی آتی جائے گی اتنا ہی اس کی حیوانیت میں کمی ہوتی جائے گی اور عقل و خرد میں ترقی ہو گی۔ مدنی زندگی میں وہ اعلیٰ مراتب حاصل کرنے کے قابل ہو سکے گا۔ محبت، حکمت، اور عدالت کی امتیازی صفات سے متصف ہو جائے گا۔ برخلاف اس کے "اگر کوئی قوم یہ عقیدہ رکھتی ہو کہ انسان بھی حیوانات کے زمرے میں داخل ہے اور بعض اوصاف میں ان سے بھی پست درجہ رکھتا ہے تو پھر ظاہر ہے کہ کس قدر کمینگی اور رذالت کا ظہور ہو گا۔ ان سے دنیا میں کس قدر خرابیاں پیدا ہوں گی۔ ان کے نفوس میں کتنی پستی اور زبوں حالی آ جائے گی۔ کے غور و فکر کی قوت سلب ہو جائے گی اور انہیں کسی کام کا نہ چھوڑے گی نہ آغاز پر نظر ہو گی اور نہ انجام پر۔"

دوسرے عقیدے کا فائدہ وہ یہ بتلاتے ہیں کہ انسان تمام قوتوں سے گوئے سبقت لے جانے کے قابل بن جاتا ہے اور عزت و اقبال، فارغ البالی اور خوش حالی کے حصول کے لیے برابر جد و جہد جاری رکھتا ہے کیونکہ وہ اپنے آپ کو اور اپنی ہی قوم کو شرف و مجد کا مستحق سمجھتا ہے۔ اس طرح مدنی اور عمرانی میدان میں سب سے آگے نکل جانے میں یہ عقیدہ معاون ثابت ہوتا ہے۔

تیسرے عقیدے سے فائدہ یہ ہوتا ہے کہ اس عقیدے کا مالک اپنی عقل کو "معارف حق اور علوم صدق سے منور کرنے کی سعی کرے گا . . . اور تمام قوائے فعلیہ اور کمالات عالیہ سے پوری طرح استفادہ کرتے ہوئے اپنے اوصاف اجاگر کرنے کی کوشش کرے گا . . . . . ہمیشہ اسی جد و جہد میں مصروف رہے گا کہ جائز طریقے سے مال و دولت حاصل ہو اور مناسب و موزوں طریقے سے اسے صرف کرے . . . . وہ دروغ گوئی، چالبازی، بے ایمانی، مکاری رشوت اور چاپلوسی سے دولت حاصل نہیں کرے گا۔" اجتماعی زندگی میں عدل و انصاف کو اپنا لائحۂ عمل بنائے گا۔

افغانی انسان کو تمام فضائل و مراتب کا حقدار سمجھتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے "قوم کا ہر فرد نبوت کے سوا کہ یہ رتبہ الٰہی ہے اپنے آپ کو تمام مراتب و خصائل انسانی کا مستحق و سزاوار سمجھے، اپنی ذات میں نقص، انحطاط اور نااہلی کے تصور کو جگہ نہ دے۔"

اقتدار

افغانی اقتدار کی اہمیت سے واقف ہیں وہ اجتماعی زندگی کے لیے اقتدار کو اتنا ہی اہم بتلاتے ہیں جتنا کہ جسمانی زندگی کے لیے غذا اور پانی ہیں۔ ان کے نزدیک قوم کے نظام کی حفاظت اور قوم کی نشوونما کے لیے اقتدار کے بغیر چارہ نہیں ہے۔ وہ اس کی تشریح اس طرح کرتے ہیں کہ قوم کے نشوونما اور استحکام کا واحد ذریعہ یہ ہے کہ دوسری قوموں پر دست درازی کی جائے اور اس سے ساز و سامان حاصل کیا جائے۔ وہ واضح الفاظ میں کہتے ہیں کہ جس قوم نے ایسا نہ کیا وہ ایک نہ ایک دن مخالف طاقتوں کے دندان آز کا شکار ہو کر ملیا میٹ ہو جائے گی۔

افغانی حصول اقتدار کا طریقہ بھی بتلاتے ہیں۔ ان کے لیے اس کا واحد طریقہ یہ ہے کہ ایسا کام کیا جائے جو فضیلت اور کمال سمجھا جاتا ہو۔ نیز حصول عزت کے اس فطری جذبہ اور خداوندی الہام کے تقاضوں کو پورا کیا جائے۔ وہ آگاہ کرتے ہیں کہ اقتدار کی منزلیں بڑی دشوار گزار ہیں اور اس کے حاصل کرنے میں بڑی بڑی تکلیفیں جھیلنی پڑتی ہیں۔

حکومت

جمال الدین افغانی حکومت کو مطلوب بالذات نہیں سمجھتے بلکہ ان کے نزدیک حکومت حفاظت دین کا ایک ذریعہ ہے اور دین بھی تہذیب اخلاق کے وسیلہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس لیے تہذیب اخلاق اور حصول فضائل بغیر حکومت کے ممکن نہیں۔ وہ حکومت کی اہمیت اور اس کی ضرورت ظاہر کرنے کے لیے قرآن مجید کی ان آیات کی طرف اشارہ کرتے ہیں جن میں کلمۂ حق کے بلند کرنے کے لیے مسلمانوں سے بار بار مطالبہ کیا گیا ہے اور خصوصاً اس آیت کا حوالہ دیتے ہیں جس میں مسلمانوں کو اس وقت تک چین سے نہ بیٹھنے کا حکم دیا گیا ہے جب تک کہ فتنے کا مکمل استیصال اور طاعت اور فرمانبرداری خالص اللہ تعالیٰ کے لیے مسلم نہ ہو جائے۔ افغانی کہتے ہیں کہ اکثر احکام دین ایسے ہیں جن کا اجرا ایک مضبوط شرعی حکومت پر موقوف ہے۔ ان دلائل کے بعد ان کا مزید کہنا ہے "اگر اقتدار اور سیادت ..... براہِ راست مذہب میں شامل نہ بھی ہوتے تب بھی ان کا حاصل کرنا ضروری ہوتا کیونکہ ان کے بغیر دیگر فرائض کا انجام دینا ناممکن ہے۔" دوسرے موقعہ پر وہ مزید وضاحت کرتے ہیں کہ "شریعت نے مسلمانوں کی سیادت اور بزرگی کا مطالبہ اس شد و مد سے کیا ہے کہ اگر کوئی مسلمان اجنبی تسلط سے گلو خلاصی کرنے سے عاجز ہو گیا ہو اور اپنے مخالفین کا حاکم بننے کے بجائے ان کا محکوم بن گیا ہو تو اس سرزمین کو جواب اس کا وطن نہیں رہی، بلکہ دار الحرب ہے، چھوڑ کر ہجرت کر جائے۔"

طرز حکومت

جمال الدین افغانی نے اپنے مضامین میں جا بجا طرز حکومت کی طرف بھی اشارہ کیا ہے۔ وہ شخصی حکومت کے

شدید مخالف ہیں اور اسے قوم کے زوال کا سبب بتلاتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں "جس قوم کا اپنے معاملات کے حل وعقد میں کوئی اختیار نہ ہو۔ ملی و ملکی امور کے بارے میں اس سے مشورہ نہ لیا جائے۔ اپنے عمومی فائدوں کی خاطر اس کے ارادے بے کار اور بے نتیجہ اور اس کی آواز صدا بصحرا ثابت ہو اور اسے ایک ہی مستبد حاکم کے سامنے جھکنا پڑے اور اس حاکم کا ارادہ ہی قانون متصور ہو اس کی خواہش ہی پر نظام حکومت کا دارومدار ہو۔ جو اپنی مرضی کے مطابق فیصلے کیا کرے اور من مانی کارروائی کرنے میں مطلق العنان ہو۔ ایسی قوم کسی حالت پر قائم نہیں رہ سکتی۔ نہ اس کی رفتار ترقی کسی قانون اور نظام کے ماتحت منظم ہو سکتی ہے۔ وہ سعادت و شقاوت، علم اور جہالت، دولت اور فاقہ کشی اور عزت اور ذلت کی کشمکش میں کبھی تنزل اور کبھی ترقی سے دوچار رہتی ہے۔" گویا کہ ان کی رائے میں شخصی حکومت کی وجہ سے قوم میں استحکام ناممکن ہو جاتا ہے اور آئے دن اس کے حالات میں تبدیلیاں ہوتی رہتی ہیں۔

جمہوریت

افغانی جمہوری نظام کی تعریف میں رطب اللساں ہیں۔ لیکن وہ اس بات سے بھی آگاہ ہیں کہ اس نظام کی کامیابی اور ناکامی کا انحصار بہت حد تک ان افراد پر ہے جن کے سپرد کاروبار مملکت چلانے کا فرض کیا گیا ہے۔ اگر اعلیٰ کردار کے افراد کسی قوم کو میسر آجائیں تو وہ قوم دنیا کی زبردست طاقت بن جائے گی جسے کوئی مغلوب نہیں کر سکتا۔ وہ لکھتے ہیں "دنیا کی کوئی قوم ایسی بتا سکتے ہو جس میں عہدیداروں کو معزول کرنے یا منصوبوں پر فائز کرنے کے اختیارات رکھنے والے، حراست و پاسبانی اور نظم و ضبط کرنے کا فرض انجام دینے والے، محاصل کو جمع کرنے اور مصائب سے بچاؤ کی تدبیریں سوچنے والے اور ان کے سارے امور کو چلانے والے اور ضروریات کا اہتمام کرنے والے قوم ہی کے افراد ہوں۔ خواہ طبقۂ علیا سے تعلق رکھتے ہوں یا طبقۂ متوسط سے یا عوام الناس میں سے ہوں اور پھر ان منصب داروں میں بھی ہر شخص قومی حقوق کا محافظ ہو۔ قوم کے مقاصد، قومی امور اور اجتماعی مصلحتوں کے خلاف کسی اور مصلحت کی طرف مائل نہ ہو۔ قومی امور میں سے کسی امر کا اہتمام کئے بغیر نہ چھوڑے اور اس طرح یہ ساری جماعت ایک مضبوط عمارت کا نمونہ پیش کرتی ہو کہ جسے نہ آندھیاں ہلا سکیں اور نہ زلزلے لرزا سکیں۔ ان سب کی انفرادی طاقتوں سے قوم کی اجتماعی طاقت کو تقویت پہنچے۔ جس سے وہ اپنے مقام کی حفاظت اور اپنے شرف اور بزرگی کی حمایت کر سکے۔ اور اغیار کے حملوں اور یورشوں کا جواب دے سکے۔ اگر ایسی قوم موجود ہے تو وہی قوم ہوگی جس میں فضائل کا دور دورہ ہو اور مکارم اخلاق کی بلند پائگی مسلم ہو چکی ہو۔"

مندرجہ بالا اقتباس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اگر قوم کی حکومت خود قوم کے افراد کے ہاتھوں میں ہو قطع نظر اس کے کہ وہ افراد اس قوم کے کس طبقے سے تعلق رکھتے ہیں تو افغانی اس کو جمہوری حکومت کا نام دیتے ہیں۔ البتہ ان افراد میں وہ

دیانت و امانت، بلند اخلاق اور اعلیٰ کارکردگی کو ضروری بتلاتے ہیں۔

جہاں تک کہ اشتراکی طرز حکومت کا تعلق ہے افغانی اس کے شدید مخالفین میں سے ہیں۔ وہ اس مساوات کو تسلیم کرنے کے لیے آمادہ نہیں جس کے قائم کرنے کے لیے اشتراکیت کے علمبردار کوشاں ہیں۔ وہ اپنے رسالہ رد نیچریت میں لکھتے ہیں کہ نیچریوں کی تمام تر کوشش یہی ہے کہ "کسی ایک شخص کو کسی چیز میں دوسرے پر برتری اور فوقیت نہ رہے اور سب کے سب مساویانہ حیثیت سے زندگی بسر کریں۔" ایسے نظام کی خرابی وہ یہ بتلاتے ہیں کہ "جب یوں ہوگا تو ظاہر ہے ہر شخص مشقت طلب کاموں سے جی چرائے گا اور اس کا نتیجہ سوائے اس کے اور کچھ نہ ہوگا کہ معاشی زندگی تباہ و برباد ہوگی معاملات و تعلقات باہمی کی چلتی گاڑی رک جائے گی۔ اور انجام کار نوع انسانی بحالت درماندگی ہلاکت کی وادی میں گر کر فنا ہو جائے گی..... تمام ظاہری اور باطنی کمالات، صوری و معنوی ترقیات، علوم و معارف اور صنعت و حرفت نیست و نابود ہو جائیں گے۔ اور انسان شرافت و انسانیت کے اعلیٰ مقام سے گر کر حیوانوں کی سی ذلت و خواری اور مصائب و آلام سے پُر زندگی گزارنے پر مجبور ہو جائے گا۔"

سربراہ مملکت

ابن خلدون سے پیشتر جتنے بھی مسلم مفکرین گزرے ہیں وہ اس بات کے علمبردار تھے کہ پوری مملکت اسلامیہ ایک ہی فرمانروا کے زیر فرمان ہونی چاہیئے۔ ابن خلدون پہلا مفکر ہے جس نے ایک ہی وقت میں دو یا دو سے زائد خلفا کے وجود کو جائز قرار دیا۔ افغانی نے بھی اسی نظریہ کو اپنایا ہے۔ ان کے زمانے میں بہت سی چھوٹی چھوٹی اسلامی حکومتیں کرۂ ارض پر پھیلی ہوئی تھیں۔ اور عثمانی خلافت کا اقتدار بھی برائے نام باقی رہ گیا تھا۔ ایسے زمانے میں افغانی جیسا عملی شخص یہ نظریہ کیسے پیش کر سکتا تھا کہ تمام اسلامی دنیا ایک ہی شخص کے زیر نگین ہونی چاہیئے۔ وہ مسلمانوں کو ایک قوم تو کہتے ہیں لیکن ان کے نزدیک یہ غیر ضروری ہے کہ ساری کی ساری قوم ایک ہی شخص کے زیر فرمان ہو بشرطیکہ ان میں اتحاد و تعاون ہو اور ایک دوسرے کے دکھ سکھ میں برابر کے شریک ہوں۔ وہ اپنے مضمون اتحاد اسلامی میں لکھتے ہیں "مسلمانوں کی علاحدہ قومیت اور تقسیم نہیں وہ صرف ایک ہی قومیت رکھتے ہیں اور وہ ہے اسلام۔ ان میں بادشاہوں اور ارباب اقتدار کے تعدد کی وہی حیثیت ہے جو قبیلہ میں متعدد رئیسوں یا ایک جنس کے افراد میں کئی سرداروں کی ہوتی ہے۔" وہ اسی مضمون میں آگے چل کر کہتے ہیں "میرا مقصد یہ نہیں ہے کہ ان تمام ممالک میں کسی شخص واحد کی حکمرانی تسلیم کی جائے کیونکہ ممکن ہے کہ اس بات کو ناقابل عمل اور مشکل سمجھا جائے لیکن یہ ضرور چاہتا ہوں کہ ان سب پر قرآن کا حکم غالب رہے اور سب مذہب اسلام کو اپنے اتحاد و اتفاق کا ذریعہ بنا لیں۔ ہر صاحب مملکت اپنے ملک کی نگہبانی کرتے ہوئے اپنے ہمسایوں کی حفاظت میں پوری طرح کوشاں رہے کیونکہ اس کی زندگی ہمسایہ

مملکت کی زندگی سے وابستہ اور اس کی بقا ہمسایہ کی بقا کے بغیر ناممکن ہے۔" اس طرح افغانی کے نزدیک اگر تمام حکمران اسلام کا بول بالا کرنے میں متحد ہوں اور ایک دوسرے کے مونس و غمخوار بنیں تو متعدد حکمرانوں کے باوجود اسلامی قومیت متاثر نہیں ہوتی ہے۔ اور حقیقت یہ ہے کہ عملی طور پر اس سے زیادہ عمدہ حل کا پیش کیا جانا ممکن نہیں ہے۔

اوصاف

افغانی سربراہ مملکت کے اوصاف کی بھی نشاندہی کرتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ حاکم کا عمدہ اوصاف کے ساتھ متصف ہونا بے حد ضروری ہے کیونکہ قوم کے تمام اچھے یا برے حالات کا انحصار حکمران ہی پر ہوتا ہے۔ وہ حکمران میں تین بنیادی اوصاف کا ہونا ضروری بتلاتے ہیں اول یہ کہ صاحب رائے ہو۔ دوم یہ کہ بلند حوصلے کا مالک ہو۔ سوم یہ کہ سلیم الطبع ہو۔ افغانی ان اوصاف ثلاثہ یعنی اصابت رائے، بلند حوصلگی اور سلیم الطبعی کے بے شمار فوائد گنواتے ہیں ان میں سے چند یہ ہیں:

۱۔ ایسا حکمران قومی سیاست کی تدبیر میں عدل سے کام لے گا اور اس کی وجہ سے ملک کے طول و عرض میں عدل ہی کا دور دورہ ہو جائے گا۔

۲۔ ان اوصاف کا حامل حکمران علم کا بڑا قدردان ہو گا اور علم کی عمارت کو بلندی تک پہنچا دے گا۔

۳۔ اس کا وجود صنعت و حرفت کے فروغ کا باعث ہو گا۔ اس کی وجہ سے نئی نئی صنعتیں پیدا ہو جائیں گی۔ صرف یہی نہیں بلکہ ان صفات کا حامل سربراہ مملکت صنعتوں میں مہارت پیدا کرنے کی سہولتیں بھی عوام کے لیے فراہم کرے گا۔

۴۔ ایسے حاکم سے عوام کی اخلاقی اصلاح بھی خود بخود ہو جائے گی۔ عوام میں عزت اور خودداری پیدا ہو گی لوگ شجاعت، غیرت اور عزت نفس جیسے بہترین فضائل سے آراستہ ہونے کے لیے آمادہ ہو جائیں گے۔ پھر یہ فضائل ان کے لیے راحت و آرام کا باعث بنیں گے۔

افغانی مزید وضاحت کے لیے ایسے حاکم کا بھی ذکر کرتے ہیں جو ان صفات سے عاری ہو۔ ان کا کہنا ہے "اگر قوم کا حاکم جاہل، بداخلاق، پست ہمت، کم حوصلہ، بزدل، بیوقوف، خسیس اور کج رو ہو تو وہ اپنے تصرف اور تدبیر سے قوم کو نقصان کے گڑھوں میں گرائے گا۔ اس کی آنکھوں پر جہالت کے پردے ڈال دے گا۔ اور اسے فقر و فاقہ میں مبتلا کر دے گا۔ تسلط اور اقتدار پسندی میں عدل کی شاہراہ سے ہٹ جائے گا۔ اور سرکشی کے مختلف دروازے کھول دے گا۔ ایسی حکومت میں قومی اور طاقت ور رعایا کمزور ہو جائے گی۔ نظام بگڑ جائے گا اور اخلاق فاسد ہو جائیں گے۔ قومی آواز کمزور ہو جائے گی اور عوام پر ہر وقت یاس و ناامیدی چھائی رہے گی۔ ایسے حالات

میں اہل غرض سلطنتوں کی للچائی ہوئی نظریں قوم پر پڑنے لگتی ہیں۔"

فرائض

سربراہ مملکت کے فرائض میں افغانی کے نزدیک اہم ترین فریضہ قیام عدل ہے۔ ان کے نزدیک عدل میں تین امور خاص طور پر داخل ہیں۔ اول ہر حق دار کو اس کا حق دینا۔ دوم ہر چیز کو مناسب جگہ دینا۔ سوم سلطنت کا کاروبار انہی لوگوں کے سپرد کرنا جو اسے سرانجام دینے پر قدرت رکھتے ہوں۔ وہ عدل کے فوائد کی بھی ایک فہرست پیش کرتے ہیں جن میں ملک کی حفاظت، بادشاہ کی قوت کا سبب، شوکت و تسلط کی بنیاد کا استحکام، داخلی نظام میں خلل واقع ہونے سے بچاؤ شامل ہیں۔ انہوں نے عدل کی اہمیت میں قرآن کریم کی اس آیت کا حوالہ دیا ہے إن الله يأمركم بالعدل والاحسان (بیشک اللہ تعالیٰ عدل و احسان کرنے کا حکم دیتا ہے) وہ مزید کہتے ہیں کہ "جس طرح باقی اجزائے عالم کے بارے میں سیدھا راستہ چھوڑنا اور اعتدال سے تجاوز کرنا ان کی ہستی کو ختم کر دیتا ہے اس طرح اجتماع انسانی کے بارے میں جادۂ اعتدال کو چھوڑ دینے سے اس کی ہستی ختم ہو جاتی ہے۔" ان کا کہنا ہے کہ من يؤت الحكمة فقد اوتي خيرا كثيرا (جس شخص کو حکمت سے نوازا گیا تو بلاشبہ اسے ایک بہت بڑے خیر سے نوازا گیا) اس آیت میں حکمت سے مراد عدل ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ قرآن مجید میں عدل کی تاکید اور ظلم کی ممانعت کی گئی ہے۔ اس کے مخاطب زیادہ تر ارباب حکومت ہی ہیں اور عدل صفات الٰہیہ میں اہم ترین صفت ہے۔

افغانی نے اس امر سے بھی بحث کی ہے کہ اگر کوئی جابر و ظالم بادشاہ برسر اقتدار آجائے تو عوام پر کیا فرض عائد ہوتا ہے۔ مسلم مفکرین میں بھاری اکثریت ان لوگوں کی ہے جو یہ کہتے ہیں کہ حکمران کتنا ہی خراب ہو لیکن رعایا کو اس کے خلاف علم بغاوت بلند نہیں کرنا چاہیئے۔ کیونکہ اس سے فتنہ و فساد کا دروازہ کھل جائے گا۔ حتیٰ کہ ابن خلدون بھی ظالم فرمانرواؤں کی برطرفی کا حق عوام کے سپرد کرنا پسند نہیں کرتا۔ ابن تیمیہ بھی اسی خیال کے حامی ہیں۔ لیکن افغانی ظالم حکمران کے خلاف بغاوت کر دینے کے حق میں ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ ظالم حاکم کے برسر اقتدار آجانے کے بعد قوم میں زندگی کے آثار موجود ہوں اور مشیت الٰہی بھی اس قوم کے لیے خیر و برکت کی خواہاں ہو تو عوام میں سے چند اصحاب رائے اور ارباب ہمت اکٹھے ہو کر اس زہریلے پودے کو بیخ و بن سے اکھاڑ دیتے ہیں اور پیشتر اس کے کہ اس کے زہریلے اثرات پوری قوم میں پھیلیں وہ لوگ اس کا خاتمہ کر دیتے ہیں۔ اس کے عوض وہ اپنے مقاصد کے لیے پاکیزہ اصولوں کا پودا لگا دیتے ہیں۔" اگر قوم میں جابر حکمران کو برطرف کرنے کی سکت نہ ہو اور وہ بے وقوف و ظالم حاکم کو من مانی کارروائی کرنے کا اختیار دیدے تو ایسی قوم غلامی کی ذلت

میں مبتلا ہو کر رسوا اور خوار ہو جاتی ہے۔

قیام عدل کے علاوہ افغانی کے نزدیک سربراہ مملکت پر ایک اور فرض اراکین حکومت کی قدردانی ہے۔ انہوں نے "عمائدین سلطنت" کے عنوان کے تحت ایک مضمون میں لکھا ہے "قوم کے بڑے بڑے کارکن جب دیکھتے ہیں کہ صاحب سلطنت ان کی خدمات کی قدر نہیں کر رہا ہے تو سلطنت کے کاروبار میں وہ دلچسپی لینا چھوڑ دیتے ہیں۔ ان میں خود غرضی بیدار ہو جاتی ہے۔ اور وہ اپنے مخصوص منافع کو فرائض عامہ پر ترجیح دیتے ہیں اس طرح قوم کے نظام میں خلل پڑتا ہے۔" اس لیے قوم کے معزز اور لائق افراد کی قدردانی کرنا وہ بادشاہ کے لیے ضروری قرار دیتے ہیں۔

ان کے نزدیک حکمران پر یہ بھی فرض ہے کہ وہ شخصی اقتدار سے الگ تھلگ رہے اور احکام الٰہی کے تابع فرماں رہے۔ اس کا فائدہ وہ یہ بتلاتے ہیں کہ اس سے اثر و نفوذ بڑھتا ہے۔ وہ واضح الفاظ میں کہتے ہیں "جب بھی کسی نے جاہ و جلال کے حصول میں عام مسلمانوں پر تفوق حاصل کرنے اور اپنی رعایا کی بہ نسبت وسائل آرام سے زیادہ متمتع ہونے کی کوشش کی ہے افراد نسلی تعصب کی طرف مائل ہو گئے ہیں۔ اختلاف بڑھ گیا ہے اور اس حاکم کا تسلط محدود ہو کر رہ گیا ہے۔" عیش پرست حکام کی وجہ سے عوام کی ہمتیں پست ہو جاتی ہیں اور وہ عملی زندگی میں تگ و دو کرنے سے جی چرانے لگتے ہیں۔ افغانی نے ہمعصر فرمانرواؤں پر نہایت دلچسپ نکتہ چینی کی ہے وہ کہتے ہیں "ہماری ہمتوں کو پست کرنے والے اور قومی حس کو عمل سے روکنے کے ذمہ دار وہ شراب کے متوالے ہیں جو لذیذ غذاؤں، نرم نرم ریشمی بستروں، فلک بوس عمارتوں، خدمت گزاروں اور حاشیہ نشینوں کے انبوہ کثیر کے شوق میں فکر فردا سے بالکل بے نیاز ہو بیٹھتے ہیں۔ وہ جشنوں اور تقریبات کے موقع پر بڑی بڑی مجلسیں قائم کر کے صدر نشین بنتے ہیں۔ جھوم جھوم کر سر ہلاتے اور شانوں کو حرکت دیتے ہیں اور یوں اپنی شان و شوکت کا اظہار کر کے سرکاری کاغذات میں نئے نئے القاب درج کر لیتے ہیں جن کے مسمی کا دنیا میں کوئی وجود نہیں ہوتا۔ یہ اخلاق سے گرے ہوئے لوگ ان بوسیدہ رسوم کے وہمی تصور میں محو ہو کر کسی گھسٹ کو قبول کرنے سے بھی دریغ نہیں کرتے۔ یہ لوگ اپنے گھروں میں دشمنوں کی ایسی ایسی ریشہ دوانیوں کو برداشت کر لیتے ہیں جنہیں کوئی غیرت مند انسان موت کی حد تک پہنچے بغیر برداشت نہیں کر سکتا۔ ہاں یہی لوگ مسلمانوں کی گردنوں کے طوق اور پاؤں کی بیڑیاں بنے ہوئے ہیں۔ انہی لوگوں نے ان شیروں کو (مسلمانوں کو) اپنے شکار سے روکا اور خود اس شکار کو لومڑیوں کی طرح لقمۂ دہن بنا گئے۔"

افغانی کے نزدیک سربراہ مملکت کا ایک فرض عمائدین سے مشورہ لینا بھی ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ "اگر کسی شخص کو اللہ تعالیٰ نے ایک پوری قوم کی حفاظت کا ذمہ دار اور کفیل بنایا ہو تو اس قوم کی نقل و حرکت اور عزل و

نصب کا مختار کل وہی ہوگا۔ ایسا شخص بلاشبہ تجربہ کاروں سے مشورہ لینے اور ان کی رائے سے فائدہ اٹھانے کا زیادہ محتاج ہے۔ اسے اس شخص کے مقابلے میں اس مشورہ کی کہیں زیادہ ضرورت ہے جو صرف اپنی ذات سے متعلق جدوجہد میں مصروف ہے۔ پھر جتنا اس کا حلقۂ اقتدار وسیع ہوگا اتنی ہی صلاح ومشورہ کی حاجت بھی بڑھ جائے گی۔" وہ شوریٰ کی اہمیت یوں بتلاتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم معصوم تھے لیکن اس کے باوجود آپؐ کو اللہ تعالیٰ نے حکم دیا کہ :

وشاورھم فی الامر (معاملات میں ان سے مشورہ لو) اور مومنین کی صفات میں" **وامرھم شوریٰ بینھم** (ان کے معاملات آپس کے مشورے سے طے ہوتے ہیں) فرمایا ہے۔ افغانی جہاں عذاب الٰہی کے نزول اور اقوام کے زوال کے اسباب سے بحث کرتے ہیں ان میں وہ اختلاف وافتراق، ناقابل اعتماد افراد پر اعتماد کرنا، اجنبی عنصر کی دخیلکاری وغیرہ کے علاوہ اہم سبب" حکومت میں خودرائی کا اظہار اور مشورہ سے انکار" بتلاتے ہیں۔

عمال حکومت

افغانی نے عمائدین سلطنت کی اہمیت پر بھی روشنی ڈالی ہے۔ ان کے نزدیک ملکوں کی حفاظت اور سلطنت کی رکھوالی کے لیے عمائدین سلطنت کا ہونا نہایت ضروری ہے حتیٰ کہ ان کا کہنا ہے کہ مستحکم فصیل، مضبوط قلعے، قوی سپاہ، لاتعداد سامان حرب کی کوئی حیثیت نہیں جب تک کچھ اصحاب فکروتدبیر اور ارباب عقل وتجربہ موجود نہ ہوں جو نظم ونسق کی ذمہ داری اپنے کاندھوں پر لیں اور عدل قائم کرکے امن قائم کریں۔

عمال حکومت کے اوصاف سے بھی افغانی نے بحث کی ہے ان کے نزدیک مندرجہ ذیل اوصاف کا پایا جانا ضروری ہے :

(۱) عمائدین کے دل سلطنت کی محبت سے معمور ہوں حتیٰ کہ جب کبھی سلطنت کے مفاد کو کوئی نقصان پہنچے تو ان کو دلی تکلیف ہو۔

(۲) رعایا کے ساتھ شفقت ومہربانی کا جذبہ ان میں کوٹ کوٹ کر بھرا ہو۔ حتیٰ کہ کسی خطرہ سے دوچار ہو تو وہ بے چین ہوجائیں۔

(۳) جذبۂ حمیت کا پایا جانا بھی ایک ضروری وصف ہے۔

(۴) عمائدین میں جوش وخروش ہو جسے وہ "حرارت" کے لفظ سے تعبیر کرتے ہیں جو ان اعمال حکومت کو ادائیگی فرائض پر آمادہ کرے اور ناموزوں اور غیر مناسب حرکات کرنے سے باز رکھے۔

افغانی کا دعویٰ ہے کہ" ان بلند اور پسندیدہ اوصاف سے متصف ارکان حکومت اپنے فرائض واشغال کو بجا طور پر ادا کرنے اور عوام کو نقصان سے بچانے پر قادر ہوسکیں گے۔" ان کے نزدیک عمال حکومت کے

فرائض میں مندرجہ ذیل امور اہم ہیں (۱) قیام امن (۲) قیام عدل (۳) شریعت کے حدود اور احکام کی نگرانی (۴) غیر ممالک سے اپنی مملکت کے تعلقات پر کڑی نظر رکھنا اور (۵) صحت مند سیاست کے ذریعہ ملک کو شایان شان بلند مرتبہ پر پہنچانا۔

عمال کا انتخاب

اب رہا یہ سوال کہ عمال کے انتخاب کے سلسلے میں کن امور کو پیش نظر رکھنا چاہیئے۔ وہ سربراہ مملکت کو تاکید کرتے ہیں کہ کاروبار مملکت کو لائق اور قابل اشخاص کے سپرد کرنا چاہیئے۔ لیکن وہ اس بات سے واقف ہیں کہ ایسے افراد کی دستیابی ذرا مشکل کام ہے۔ وہ خود کہتے ہیں کہ سربراہ مملکت زر کثیر خرچ کر کے بڑے سے بڑا لشکر جمع کر سکتا ہے۔ لیکن سمجھدار، ہمدرد، غیرت مند، اور برگزیدہ افراد محض روپیہ خرچ کر کے میسر نہیں آ سکتے۔ انہوں نے عمال کے انتخاب کے سلسلے میں ایک عام اصول یہ بتلایا ہے کہ طبعی قواعد کی پیروی کی جانی چاہیئے۔ ایک مضمون میں انہوں نے لکھا ہے "جو شخص ناموس طبعی کو راہبر بناتا ہے اور اس کے دکھلائے ہوئے راستے پر قدم بقدم چلتا ہے۔ وہ بہت کم رائے کی غلطی یا بے راہ روی میں مبتلا ہوتا ہے۔" ان کا دعویٰ ہے کہ اگر انسانی غلطیوں کا مکمل جائزہ لیا جائے تو یہ حقیقت عیاں ہو جائے گی کہ ان غلطیوں کا سب سے بڑا سبب "قانون فطرت سے کنارہ کشی اور کائنات کے بارے میں اللہ تعالیٰ کی سنت جاریہ کے مطابق عمل سے انحراف" ہے۔ چونکہ وہ عمائدین سلطنت میں حب الوطنی، رعایا کے ساتھ شفقت، جذبۂ حمیت اور ادائیگی فرائض میں جوش و خروش کو ضروری بتلاتے ہیں اس لیے ان کے نزدیک ان اعمال کا اسی قوم سے تعلق رکھنا ضروری ہے۔ اس کی وہ دلیل یہ دیتے ہیں "قانون فطرت کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ اہل سلطنت رعایا کے بارے میں شفقت، مہربانی، حمیت اور غیرت صرف انہیں لوگوں کا حصہ ہے جن کا خاندانی رشتہ قوم کے ساتھ مضبوط اور برادرانہ ہو۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کی فطرت میں یہ خاصیت رکھی ہے کہ جو شخص قوم کے ساتھ جنسیت اور مسلک کے رشتے میں مربوط ہو وہ قوم کے بارے میں اپنی ذمہ داریوں اور تعلق کا خاص خیال رکھتا ہے۔ اس لیے اس تعلق میں اس کے ساتھ جتنے لوگ بھی مربوط ہیں ان سب کی طرف سے وہ ذلت اور ظلم کی مدافعت اسی طرح کرتا ہے جس طرح اپنے گھر اور جاگیر کی کرتا ہے۔"

اس طویل تمہید کے بعد وہ سربراہ مملکت کو ہدایت دیتے ہیں کہ عمال حکومت کے انتخاب کے وقت صرف وہی قسم کے لوگ پیش نظر رہیں۔ پہلا وہ شخص جس کے ساتھ حاکم کا رشتہ مضبوط ہو اور مضبوطی بھی ایسی ہو جس میں کمزوری اور انقطاع کا امکان نہ ہو۔ مزید یہ کہ حاکم کے تمام رشتہ دار بھی اس شخص کا احترام کرتے ہوں۔ افغانی کے اس نظریہ کو کسی جامہ پہنانے کی صورت میں خویش پروری کی وبا عام ہو جانے کا شدید اندیشہ ہے۔ پھر ایسی صورت میں جبکہ حاکم اعلیٰ اور رعایا مختلف قوموں سے تعلق رکھتے ہوں تو مشکلات میں زبردست اضافہ ہو جائے گا۔ اگر حاکم اعلیٰ

افغانی کے مشورے کے مطابق کاروبار مملکت کو اپنے ہم جنس اور ہم قوم افراد کے سپرد کرے تو یہ امر رعایا کی بدگمانی کا باعث ہوگا۔ اور اگر رعایا کے ہم جنس افراد کو برسر اقتدار لایا جائے تو حاکم اعلیٰ اور عمال میں تعاون کا ہونا دشوار ہو جائے گا۔

دوسرا شخص جس کے عامل بنائے جانے کی افغانی سفارش کرتے ہیں وہ ہے کہ صاحب سلطنت اور اس میں کوئی گہرا تعلق ہو جو مضبوطی اور استواری میں خاندانی رشتے کا قائم مقام ہو بلکہ دلوں میں اس کی قدر و منزلت خاندانی رشتہ کی قدر و منزلت سے زیادہ ہو۔ اس تعلق کی مثال وہ اسلام سے دیتے ہیں۔ اور کہتے ہیں کہ مسلمان اسلام کو ہر ایک تعلق اور رشتہ سے بہت برتر سمجھتے ہیں نیز اسلام کا اثر مختلف گروہوں اور قبیلوں پر ایک ہی جیسا ہے۔ ایسے لوگوں سے بھی ملکی حمیت اور ہمدردی کی توقع رکھی جاسکتی ہے۔

افغانی کا دعویٰ ہے کہ اگر حاکم اعلیٰ اور اس کے ماتحت عمال میں اگر ان دو تعلقات ——— رشتہ اور دین ——— میں سے کوئی بھی تعلق نہ ہو تو عمال حکومت کی حیثیت مزدور سے زیادہ نہیں ہے۔ ایسے لوگوں کو ملک وسلطنت سے زیادہ مال و دولت سے محبت ہوتی ہے۔ بالخصوص وہ غیر ملکی افراد کے اخلاق کو بے حد مشتبہ بتلاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ یہ غیر ملکی اپنے وطن سے دوسرے ملک میں صرف اسی لیے جاتے ہیں کہ وہ زر و مال حاصل کریں۔ اور ایسا شخص جس نے زر و مال کو اپنی زندگی کا مقصد بنا لیا ہو اس پر اعتماد کرنا حماقت ہے کیونکہ وہ حق و باطل، وفاداری اور غداری، امانت اور خیانت میں کوئی تمیز نہیں کرے گا۔ وہ مزید کہتے ہیں کہ ان غیر ملکیوں کو کاروبار مملکت سپرد کر دیا گیا تو ان کی تمام تر توجہ اپنی ہی قوم کو فائدہ پہنچانے اور اس کو بالادستی دلانے کی طرف مبذول رہے گی۔ افغانی کے عہد میں بھی تقریباً تمام اسلامی ممالک میں یورپی اقوام کے لوگ بڑے بڑے عہدوں پر فائز تھے۔ ان کا کام سوائے اس کے کچھ نہ تھا کہ وہ اسلامی ممالک میں رہ کر حکومت کی جڑیں کھوکھلی کرتے رہیں اور اپنے ملک کے مفاد کی حفاظت کریں۔ آج بھی افغانی کا یہ نظریہ مسلم ممالک کو دعوت فکر دے رہا ہے اور ان کے یہ الفاظ ایک صدی گزر جانے کے بعد بھی کس قدر سچے ہیں کہ "ممالک اسلامیہ میں جو اجنبی افراد ملازمت کر رہے ہیں ۔ ۔ ۔ ۔ ان کے دلوں میں سچائی اور امانت کا کوئی جذبہ نہیں۔ ہاں دھوکے اور خیانت کے لیے ہر وقت تیار رہتے ہیں۔"

افغانی نے حاکم اور ماتحت عملے میں مکمل تعاون اور اعتماد کی ضرورت پر بھی زور دیا ہے۔ اور دونوں کا ہم خیال ہونا ضروری بتلایا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ "جس کام میں اس شخص پر اعتماد کیا جائے جو قابل اعتماد نہ ہو اور جس کا آسرا لینا کارآمد نہ ہو وہ کام خلل پذیر اور فاسد ہو جائے گا۔ اگر دو شخصوں کی طبیعت میں کوئی لگاؤ نہیں، ان دونوں کے درمیان کوئی حقیقی تعلق نہیں۔ وہ دونوں کسی صحت مند رابطہ میں مربوط نہیں۔ ان میں سے ایک کی طبیعت میں وہ جذبہ ہی نہ ہو

جو دوسرے کی مصلحت کی رعایت کرنے اور اس کا راز چھپانے پر آمادہ کرے۔ نہ اس کی فطرت میں وہ داعیہ ہو جو اپنے ساتھی کو نفع پہنچانے، اس کی تکلیفیں دور کرنے کے لیے تیار کرے اور پھر بھی مؤالذکر اپنے کام میں اس پر اعتماد کرتا رہے تو اس میں کیا شک ہے کہ ایسے شخص کا انجام برا ہوگا۔ اگر وہ بادشاہ ہے تو اس کی سلطنت ختم ہو جائے گی۔ اور حاکم ہے تو اس کی حکومت جاتی رہے گی۔" ابن تیمیہ کے نزدیک حاکم اعلیٰ اور عامل میں متضاد اخلاق ہونے چاہئیں تاکہ ایک دوسرے کی تکمیل کرے۔ افغانی اس سے اختلاف کرتے ہیں۔

افواج

عمائدین کے صحیح انتخاب کے بعد وہ جس چیز پر سب سے زیادہ زور دیتے ہیں وہ فوج ہے۔ وہ فوجوں کے جمع کرنے اور انہیں آلات جنگ سے لیس کرنے کی ضرورت نہایت دلچسپ پیرائے میں بیان کرتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے "کسی ملک کا امیر، کسی سلطنت کا مالک اگر تھوڑی دیر کے لیے اپنی طرف متوجہ ہو تو اسے معلوم ہوگا کہ اس کا وطن ہر وقت لالچیوں کے نرغے میں ہے۔ انسان فطری طور پر ہر وقت اپنے پڑوسیوں کے ملک پر قبضہ کرنے کی فکر میں رہتا ہے۔ چنانچہ وہ دیکھے گا کہ اس کے پڑوسی یہی چاہتے ہیں کہ اس کی قوم کو ذلیل کریں۔ باشندگانِ ملک کو غلام بنائیں۔ ان کی زمین کی پیداوار اور ان کی محنت کا پھل ان کے ہاتھوں سے چھین کر اپنے ہم وطنوں کو دلائیں۔" اسی لیے وہ ملک کی مدافعت کے لیے فوج اور سامان جنگ جمع کرنے کو والیانِ حکومت کے لیے لازمی بتلاتے ہیں اور انہیں تنبیہ کرتے ہیں کہ اگر ایسا نہ کیا گیا تو وہ اپنے ملک کو ہلاکت کا لقمہ بنائیں گے۔ اور اپنے آپ کو خطرات کے عمیق غاروں میں دھکیل دیں گے۔ افغانی فرمان الٰہی کا حوالہ دیتے ہیں کہ: اعدوا لھم ما استطعتم من قوۃ (اپنے دشمنوں کے مقابلے کے لیے طاقت کا ہر وہ حربہ تیار رکھو جو تمہارے بس میں ہو) اور کہتے ہیں ما استطعتم میں سامانِ جنگ کے انواع و اقسام اور مقدار کی کوئی تعیین نہیں ہے اس لیے زمانے کے تقاضے اور خطرناک دشمنوں کے حالات کے مطابق اسلحات کا فراہم کرنا فرض ہے۔ اسی لیے وہ جدید اسلحات کے نہ صرف حاصل کرنے بلکہ ان کے ایجاد کرنے کی ضرورت پر بہت زور دیتے ہیں اور مہلک ہتھیار اور تباہ کن آلات کے استعمال میں کوئی مضائقہ نہیں سمجھتے۔

جہاد

افغانی پوری طرح مسلم عوام کے لیے جہاد کی اہمیت واضح کرتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ حق کی راہ میں قدم بڑھانا اور حق کے بول بالا کرنے کے لیے جان و مال کو قربان کر دینا مومن کی سب سے پہلی علامت ہے۔ ان کا دعویٰ ہے کہ قرآن مجید نماز کو قائم کرنے، زکوٰۃ دینے اور جنگ و جدل سے باز رہنے کی تعلیم پر اکتفا نہیں کرتا کیونکہ ان اعمال میں مومن، کافر اور منافق سب شریک ہو سکتے ہیں۔ عدل الٰہی کو پھیلانے اور کلمۂ حق کو بلند کرنے کے لیے جاں نثاری کو قرآن کریم نے

بنیادی رکن قرار دیا ہے۔ اسی لیے وہ ایک مضمون میں بزدلی کی مذمت یوں بیان کرتے ہیں: "بزدلی ایک جال ہے جو نفوس انسانی کو شکار کرنے اور قوموں کا صفایا کر جانے کے لیے حوادث زمانہ نے پھیلا رکھا ہے جس میں شیطان اللہ کے بندوں کو پھانس کر راہ الٰہی سے روکنے میں کامیاب ہوتا ہے۔ یہی ہر کمینگی اور بری خصلت کی جڑ ہے۔ کوئی بدبختی نہیں جو بزدلی سے شروع نہ ہوتی ہو۔ کوئی خرابی نہیں جس کے جراثیم اس میں موجود نہ ہوں۔ کوئی کفر نہیں جس کے لیے یہ سبب اور علت کا کام نہ کرتی ہو۔ اسی نے جماعت کو ٹکڑے ٹکڑے کیا . . . . بزدلی ننگ ہے، عار ہے، ہر انسانی فطرت کے لیے عموماً ان لوگوں کے لیے خصوصاً جو اللہ اور اس کے رسولوں اور روز جزا پر ایمان رکھتے ہیں اور اپنے اعمال کے نتیجے میں اجر حسن اور مقام کریم کو حاصل کرنے کے امیدوار ہیں۔" وہ آگے چل کر مسلمانوں کو آگاہ کرتے ہیں "خبردار یہ خیال مت کرنا کہ اسلام اور بزدلی کا ایک ہی دل میں جمع ہونا ممکن ہے۔ دین کا جزو ہمارے سامنے بہادری اور اقدام کا تصور پیش کرتا ہے۔"

ملکوں کی مدافعت میں بزدلی کے علاوہ ایک اور جذبہ سد راہ بنتا ہے۔ وہ وہم ہے۔ بزدلی کی طرح افغانی نے وہم کی مذمت میں مضامین لکھے ہیں اور ثابت کیا ہے کہ کس طرح وہم قوموں کو غلامی کی زنجیر میں جکڑ دیتا ہے۔ اور بغیر جنگ کیے لوگوں کو سر تسلیم خم کرنے پر مجبور کر دیتا ہے۔ کمزور کو قوی، قریب کو دور، امن کو خوف، اور جائے پناہ کو ہلاکت گاہ کی شکل میں دکھانا وہم کا ایک ادنیٰ کرشمہ ہے۔ وہ وہم کے اثرات کو ذہن نشین کرانے کے لیے ایک دلچسپ کہاوت نقل کرتے ہیں کہ اصطخر میں ایک طلسم خانہ تھا اور جو مسافر اس طلسم خانہ کے قریب رات بسر کرنے کے ارادہ سے ٹھہرتا وہ موت کا شکار ہو جاتا۔ اور صبح کو اس کی لاش ملتی جس پر چوٹ وغیرہ کے بالکل نشانات نہ ہوتے۔ لوگ اس طلسم خانہ سے بے حد خوفزدہ تھے۔ اتفاقاً ایک ایسا شخص جس نے خودکشی کرنے کی ٹھان لی تھی، طلسم خانہ میں پہنچا۔ اسے نہایت ڈراؤنی آوازیں سنائی دیں لیکن وہ جان دینے ہی کے لیے گیا تھا نہ ڈرا تو اس طلسم خانے سے اسے بے شمار دولت ملی۔ بعد میں معلوم ہوا کہ لوگ صرف ان مہیب آوازوں کو سن کر سہم جاتے اور مارے ڈر کے دم مر جاتے تھے۔" افغانی نے یہ کہاوت بیان کرنے کے بعد لکھا ہے کہ قوموں پر بھی دوسری اقوام کا رعب اسی طرح مسلط رہتا ہے۔ اور بالخصوص مسلم ممالک کا انگریزوں سے خوفزدہ ہونا اصطخر کے طلسم خانے کے وہم سے کم نہیں ہے۔

دفاع

افغانی مدافعت کے ان سلبی ذرائع —— بزدلی اور وہم سے نجات —— ہی کو بیان نہیں کرتے بلکہ اس کے لیے ایجابی اصولوں سے بھی بحث کرتے ہیں۔ ان کے نزدیک مدافعت کے تین اصول ہیں:

(۱) ان تدابیر کو اچھی طرح سمجھ لینا جن کے ذریعہ خطرات کی مدافعت کی جا سکتی ہے۔

(۲) خطرات کے پیش آتی ہی ان کی مدافعت میں ہمہ تن مشغول ہوجانا۔ اور
(۳) آنے والے خطرات کا حقیقی احساس کرکے ایک دوسرے کے ساتھ دلی ہمدردی رکھنا اور اخوت کے رشتے میں منسلک ہوجانا۔

وہ اپنے زمانے کے روس کی مثال دیتے ہیں کہ روس دولت و ثروت اور صنعت و حرفت میں یورپی ممالک کے مقابلہ میں پس ماندہ ہے لیکن اس کے باوجود قومی دفاع کی تدابیر سے عوام کی آگاہی نیز ان تدابیر کے بروئے کار لانے کے لیے ان میں اتفاق و اتحاد موجود ہے جس کا نتیجہ یہ ہے کہ روس کی دھاک پوری دنیا پر جمی ہوئی ہے اور اس نے افلاس کے باوجود اسلحات خریدے اور غیر ملکی فوجی ماہرین کو بلایا۔ افغانی مسلم ممالک کو روس کی تقلید کرنے کی تلقین کرتے ہیں۔ یہ امر ملحوظ رہے کہ افغانی غیر ملکی اور اجنبی عمال حکومت کے تقرر کے شدید مخالف ہیں اور جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے وہ اس قسم کے افراد کے حوالہ کاروبار مملکت کے کیے جانے کے نقصانات کی ایک لمبی چوڑی فہرست پیش کر دیتے ہیں لیکن روس کے غیر ملکی فوجی ماہرین کو ملازم رکھنے کی وہ بڑی تعریف کرتے ہیں۔ یہ غالباً اس کا ردعمل ہے کہ ترکی کے علماء نے عثمانی حکومت کو جدید اسلحات کے استعمال کرنے اور غیر ملکی فوجی ماہرین کو بلانے کی ہمیشہ مخالفت کی تھی جس کا نتیجہ افغانی اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے تھے۔ اور ان کی چشم دوربین سے یہ بات پوشیدہ نہ تھی کہ اگر یہی لیل و نہار رہے تو دولت عثمانیہ کا وجود بھی خطرے میں پڑ جائے گا۔ اور یورپی اقوام اسے ہڑپ کر جائیں گی۔

تعلیم

افواج کے بعد افغانی تعلیم کو بہت اہمیت دیتے ہیں۔ جس طرح کہ فوجیں غیر ملکی حملوں سے سلطنت کی حفاظت کرتی ہیں اسی طرح علوم داخلی امن و امان اور رعایا کے درمیان اتفاق و اتحاد کے ضامن ہیں۔ وہ علم اور حکومت کا گہرا تعلق بتلاتے ہیں۔ ان کے نزدیک ملت اسلامیہ کے اتحاد کے خاتمہ اور ان میں فرقہ بندی کے راہ پا جانے کی ابتدا اس طرح ہوئی کہ خلفائے عباسیہ نے خلافت اور علم کو علاحدہ کر دیا۔ اور انہوں نے خلافت پر قناعت کی اور علم کو خیرباد کہہ دیا۔ عباسی خلفاء فقہ اور اصول و فروع میں اجتہاد کرنے اور علمی ترقی کے وسائل جمع کرنے سے قاصر رہے۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ بہت سے فرقے معرض وجود میں آ گئے۔ ان فرقوں کے باعث خلافت کی وحدت کا خاتمہ ہوگیا۔ اور اسلامی ممالک تین حصوں میں بٹ گئے۔ بغداد میں تو عباسی خلافت رہی۔ مصر اور مغرب اقصیٰ فاطمیوں کے قبضے میں چلے گئے۔ اندلس پر امویوں کا اقتدار قائم ہوگیا اور خلافت کا درجہ انحطاط پذیر ہو کر ملوکیت پر آ گیا۔ لوگوں کے دلوں سے خلافت کا رعب و دبدبہ جاتا رہا۔ ملک و سلطنت کے طلب گاروں نے اس کے حقوق و رعایا کو بالائے طاق رکھ کر صرف طاقت کے بل بوتے پر حکومت حاصل کرنے کے نئے نئے ڈھنگ اختیار کر لیے۔ اس طرح افغانی بہت حد تک

ماوردی کے ہم نوا ہیں کہ خلفاء کو مجتہدانہ صلاحیتوں کا مالک ہونا چاہیئے تھا لیکن وہ سربراہ مملکت کے اوصاف میں صرف اس وصف کا مطالبہ کرتے ہیں کہ وہ علم کا قدر دان ہو اور علم کی عمارت کو بلندی تک پہنچا دے۔ غالباً اپنے ہم عصر حکمرانوں کی علمی لیاقت کے پیش نظر انہوں نے یہ قابل عمل نظریہ پیش کیا ہے۔ اس طرح افغانی نے فرمانروا میں علم کے معیار کے متعلق ماوردی اور غزالی کے مختلف نظریات کے درمیان ایک نئی راہ نکالی ہے۔

افغانی کے زمانے میں قدیم اور جدید علوم میں سخت رسہ کشی تھی۔ قدامت پرست طبقہ اپنے قدیم علوم و معارف سے باہر قدم رکھنے کے لیے آمادہ نہ تھا اور جو لوگ جدید علوم کی طرف مائل تھے ان پر کفر کا فتویٰ جاری کرنے میں اس نے نہایت بے باکی کا ثبوت دیا۔ اسی طرح جدید علوم کے حامیوں کے نزدیک قدیم علوم کی کوئی وقعت نہ تھی۔ افغانی دونوں طبقوں پر شدید نکتہ چینی کرتے ہیں۔ وہ قدامت پرست علما کے متعلق لکھتے ہیں "عجیب بات یہ ہے کہ ہمارے علماء "صدری" اور "شمس بازغہ" پڑھ کر اپنے آپ کو فخریہ طور پر حکیم کہتے ہیں۔ مگر حال یہ ہے کہ وہ اپنے سیدھے اور بائیں ہاتھ میں تمیز نہیں کر سکتے اور نہ یہ پوچھتے ہیں کہ ہم کیا ہیں اور کیوں ہیں۔ ہم کو کیا ہونا چاہیئے اور کیا کرنا چاہیئے . . . . عجیب تر بات یہ ہے کہ لوگ اپنے سامنے لیمپ رکھ کر اول شب سے لے کر شمس بازغہ کا مطالعہ کرتے ہیں لیکن ایک دفعہ بھی غور نہیں کرتے کہ لیمپ کی چمنی نکالی جائے تو دھوآں زیادہ کیوں دیتا ہے اور اس پر رکھ دی جائے تو دھوآں کیوں نہیں دیتا۔ پتھر پڑیں ایسے حکیم پر اور ایسی حکمت پر۔" وہ علماء کو لایعنی مباحثوں اور غیر مفید مسائل میں دلچسپی لینے سے یوں باز رکھتے ہیں "کیا تمہاری پاک طینت اور تمہاری مقدس فطرت الٰہیہ واقعی اس بات پر راضی وخوشنود ہو جاتی ہے کہ اپنے روشن اور تابندہ ذہنوں کو ایسے مباحث میں صرف کرو جیسے تصدیق کے تصور کے وقت دو چیزوں کا متحد ہونا لازم آتا ہے یا نہیں۔ اگر زید کہتا ہے کہ جو کچھ کل میں کہوں گا وہ جھوٹ ہوگا اور جب کل آجاتا ہے تو کہتا ہے کہ گذشتہ کل جو کچھ کہا تھا وہ جھوٹ تھا۔ لیکن اس کا جھوٹ مستلزم سچ اور اس کا صدق مستلزم کذب نہ ہوگا۔"

افغانی یورپی طرز تعلیم کے دلدادہ لوگوں پر بھی شدید نکتہ چینی کرتے ہیں۔ ان کے نزدیک علم سے مندرجہ ذیل فوائد حاصل ہونے چاہئیں:

(۱) علم قوم کی مالی حالت کو بہتر بنا دے اور قوم کو کم از کم فقر و فاقہ کے پنجے سے نجات دلا سکے۔

(۲) دشمنوں کی ریشہ دوانیوں کے خلاف علم کی روشنی میں تدابیر اختیار کی جا سکیں اور ان کو ناکام بنانے میں کامیاب ہوا جا سکے۔

(۳) علم کے ذریعہ قوم کی عسکری قوت میں اضافہ ہو۔

(۴) علم کے باعث اتنی دوربینی اور عاقبت اندیشی کی صفات پیدا ہو جائیں کہ حریص و طامع لوگ آنکھ اٹھا کر

دیکھنے کی بھی ہمت نہ کر سکیں۔

(۵) علم کے ذریعہ ایسے افراد پیدا ہوں جو ملکی مصلحت کو باقی سارے مصالح پر ترجیح دیں اور ہمہ وقت اسی میں مشغول رہیں۔ اور اپنی جان و مال کو ملکی مفاد پر قربان کر دیں۔

افغانی علماء کی اہمیت اور ان کے فرائض کو بھی زیر بحث لاتے ہیں۔ وہ علماء کو یاد دلاتے ہیں کہ انہیں نہ بھولنا چاہیئے کہ وہ وارث انبیاء ہیں۔ افغانی کے نزدیک علماء پر مندرجہ ذیل فرائض عائد ہوتے ہیں :

(۱) دینی رابطہ کو زندہ کرنے کے لیے اٹھنا۔ اللہ تعالیٰ کے عائد کردہ فرائض اور دین کی مقرر کردہ عبادات سے غفلت کرنے والوں کو جھنجھوڑ جھنجھوڑ کر جگانا۔

(۲) ملکی اختلافات کا تدارک کرنا اور لوگوں میں اتفاق و اتحاد کا شعور پیدا کرنا جس میں مساجد و مدارس میں اتحاد کے مرکزوں کا قیام شامل ہے۔

(۳) اللہ تعالیٰ کے وعدے سنانا تاکہ لوگوں کے دلوں سے خوف و ہراس نکل جائے اور اس کی وعید کو بھی یاد دلانا۔

(۴) قدیم اقوام کے حالات کے ذریعہ یہ امر ذہن نشین کرانا کہ جب کبھی کسی قوم نے خدا کے قوانین و احکام کی خلاف ورزی کی تو وہ ذلیل خوار ہوئی۔

(۵) عوام کے سامنے خود کو ایک نمونہ کے طور پر پیش کرنا۔

تاریخ جمہوریت

مصنفہ شاہد حسین رزاقی

قبائلی معاشروں اور یونانِ قدیم سے لے کر عہد انقلاب اور دور حاضر تک جمہوریت کی مکمل تاریخ جس میں جمہوریت کی نوعیت وارتقاء، مطلق العنانی اور جمہوریت کی طویل کش مکش، مختلف زمانوں کے جمہوری نظامات اور اسلامی و مغربی جمہوری افکار کو بڑی خوبی سے واضح کیا گیا ہے۔

صفحات ۵۰۶ قیمت -/۸ روپے

ملنے کا پتہ: ادارہ ثقافت اسلامیہ۔ کلب روڈ۔ لاہور